

یہ کہانی آپ کے لیے دعوتِ عشق ہے، کیا آپ یہ دعوت قبول کریں گے؟

علیم الحق حقی

عشق کا عین

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک اگل کا دریا ہے اور ڈوب کے جانے

عشق... کائنات کا سب سے طاقتور، لازوال اور حسین جذبہ جو شاعری کی بنیاد اور صوفیاء کا مسلک رہا ہے۔ عشق کیا ہے؟ اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے... اور قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا لیکن اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکے گا۔ شاید اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ عشق حقیقی ہوتا ہے صحیح روپ میں نظر آتا ہے۔ پہلے یہ عشق انسان کو معرفت عطا کرتا ہے اور اس کے لیے زمان و مکان کے فاصلے مٹ جاتے ہیں یہ داستانِ عشق اس خطے کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جہاں کے رہنے والے صاحبِ دل ہونے کے ناتے جہاں نازنینوں اور مہ جبینوں کے کالو و رخسار پر فریفتہ ہونے کا جذبہ رکھتے ہیں وہاں عشق حقیقی اُن کی معاشرت کی ایک مستحکم روایت اور قدر ہے جسے ایمان کے درجے پر برتا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو عاشقوں کی نسل سے تھا... جسے گھٹی میں بھی عشق حقیقی کے جذبے گھول کر پلائے گئے تھے اور یہ تلقین ہوش سنبھالنے سے آخری دم تک اُس کے ساتھ رہی۔ ابتداء میں اس کی سمجھ میں یہ عشق نہیں آتا تھا۔ وہ عشق کی اس تلقین سے گھبرا کر گھر ہی چھوڑ دیا گا... لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ عشق اُس کا مقدر کیا چکا ہے۔ سو حالتِ فرار میں یہ نادیدہ زنجیر اُس کے پیروں میں پڑ گئی۔ ایک سیمیں بدن، شیریں سخن اور غنچہ دہن کے عشق سے لے کر عشق حقیقی تک کے دل گداز جذبوں میں گدھی ہوئی یہ کہانی سطر بہ سطر آپ کے دل میں اُترتی چلی جائے گی۔





الٹی بخش کو پہلی نظر میں مشق ہو تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کا خیر ہی مشق کی مٹی سے اٹھا تھا۔

اس سلسلے میں اس کی پہلی یاد ہی ایسی تھی جو اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت پانچ ساڑھے پانچ کا سال ہو گا۔ وہ گندم کے کھیت کے سامنے کچھ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ان میں تین بچے سادات کے بھی تھے۔ کھیل کھیل میں ایوب شاہ اور نواز شاہ نے بے ایمانی شروع کر دی۔ اس نے اس پر احتجاج کیا تو دونوں نے مل کر اس کی ہٹائی کر دی۔ ایک تھپڑا لگا کہ اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ تکلیف کا احساس تو نہیں ہوا تھا لیکن اس کی نظر دھار کی شکل میں گرتے ہوئے خون پر پڑ گئی۔ اس نے آستین سے ناک صاف کرنے کی کوشش کی تو آستین خون میں تر ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس پر جنون طاری ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکا کر زمین پر اِدھر اُدھر دیکھا پھر وہ زمین پر پڑے ایک پتھر کی طرف جھپٹا۔

ادھر وہ دونوں بھی بہتا ہوا خون دیکھ کر دم بہ خود رہ گئے تھے۔ وہ خوف زدہ نظروں سے خون کو دیکھے جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے پتھر اٹھاتے دیکھا۔ لیکن درحقیقت نہیں دیکھا۔ وہ یوں بُت بنے کھڑے تھے کہ پتھر گرنے تک تو ان کی سحر زدگی ٹوٹنے والی نہیں تھی۔ مگر پتھر گرنے کی نوبت ہی نہیں آئی!

الٹی بخش کا پتھر والا ہاتھ بلند ہوا، نیم قوس کی شکل میں پیچھے کی طرف گیا اور آخری مرحلے میں آگے کی سمت لپک ہی رہا تھا کہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اس کے پورے جسم کی قوت اس وقت تک استعمال میں آچکی تھی۔ چنانچہ اسے شدید جھٹکا لگا۔ اس کا پورا جسم ہل کر رہ گیا۔ سوائے پتھر والے ہاتھ کے کہ وہ بڑی مضبوط گرفت میں تھا۔ اس کا جسم آگے کی طرف گیا اور پھر ردِ عمل کے طور پر پیچھے ہٹا۔ ذرا سنبھلنے کے بعد اس نے سر تھما کر دیکھا۔ اس کا پتھر والا ہاتھ ابا کی گرفت میں تھا۔

وہ ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگاتا رہا لیکن ابا کی نگاہوں میں جتنی نرمی تھی گرفت میں اس سے زیادہ سختی تھی۔

”ابا! چھوڑ دو مجھے“ وہ چلاتا ”میں ان کا سر بچاؤں گا۔۔۔“
”نابالکے پتھر پھینک دے“ ابا نے بہت شیریں لہجے میں کہا۔
”ابا! انہوں نے مجھے مارا ہے۔ یہ خون دیکھو“ اس نے فریاد کی۔ پتھر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

”میں دیکھ رہا ہوں۔ تو پتھر تو چھوڑ۔ پھر میں کچھ کرتا ہوں۔“
”کچھ کرتا ہوں“ سے الٹی بخش کو آس تو بندھی لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ پتھر اس نے اب بھی نہیں چھوڑا۔

”تو میری بات نہیں مانے گا“ باپ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

اس بار ننھے الٹی بخش نے پتھر ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ باپ نے

فوراً ہی اسے گود میں اٹھایا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ گھر میں کھتے ہی وہ صحن میں لگے ہینڈ پمپ کی طرف لپکا۔ اس نے الٹی بخش کو بٹھایا اور خود ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی الٹی بخش کے سر پر گرا تو وہ اچھلا۔ وہ بھاگنے ہی والا تھا کہ باپ نے ٹپٹ کر کہا ”بیٹھا رہ۔ ابھی خون رک جائے گا۔“

ماں آوازیں سن کر کمرے سے نکلی تو یہ منظر دیکھ کر ان کی طرف جھپٹی ”کیا ہوا۔۔۔ یہ کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ کھیل میں چوٹ لگ گئی ہے۔ نکسیر پھوٹی ہے۔ تم چلو میں پانی لے کر اس کی ناک میں پانی ڈالوں۔“

ذرا دیر میں خون رک گیا مگر اس وقت تک الٹی بخش کے کپڑے بھیگ چکے تھے اور اسے سردی لگ رہی تھی ”چل۔۔۔ اندر چل“ باپ نے اس کا ہاتھ تھاما اور کمرے کی طرف چلا۔ ”تم اس کے کپڑے نکالو“ اس نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

الٹی بخش کو کپڑے بدلوانے کے بعد ماں نے اس سے پوچھا۔
”اب یہ تو بتا، ہوا کیا تھا۔“

”اماں! وہ کھیل میں بے ایمانی کر رہے تھے۔ میں نے منع کیا تو دونوں نے مل کر مجھے مارا“ الٹی بخش نے سورتے ہوئے کہا۔ وہ دکھ اور شرمندگی سے شل ہو رہا تھا۔ دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اسے چوٹ لگی۔ دکھ یہ تھا کہ وہ بدلہ نہیں لے سکا۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

”کون تھے وہ دونوں۔ تو مجھے بتا، میں ان کی خبر لوں گی“ ماں بھر گئی۔

”ایوب شاہ اور نواز شاہ“ اس نے بتایا۔
نام سنتے ہی ماں کو بھی سانپ سو گئے گیا پھر وہ سنبھل کر بولی ”تو بیٹھ۔ میں تیرے لیے دودھ لاتی ہوں۔“

ننھے الٹی بخش کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ باپ نے تو اسے مایوس کیا ہی تھا لیکن ماں تو ان کی خبر لینے جا رہی تھی پھر اسے کیا ہو گیا۔ ان کے نام سنتے ہی اس کا رویہ کیوں بدل گیا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ اور یہ مشکل بھی نہیں تھا۔ موقع تو ضرور ملے گا۔ بس پھر وہ پتھر اٹھائے گا اور۔۔۔

”بیٹے! یہ خیال دل سے نکال دے“ باپ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ جیسے اس کی سوچیں پڑھ رہا تھا۔
”کیا ابا!“

”وہی جو تو سوچ رہا ہے۔“

اتنی دیر میں ماں دودھ کا پیالہ لے آئی تھی ”لے۔۔۔ یہ پیالہ“

الٹی بخش نے پیالہ لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا ”میں دودھ نہیں پیوں گا اماں“ اس نے جواب دیا۔ وہ اس وقت کچھ پینا چاہتا

فانہ صرف ان دونوں لڑکوں کا خون، جنہوں نے اس کے ساتھ نادانی کی تھی۔

”ہاں لے بیٹا۔“ ماں کے لہجے میں اصرار تھا۔

الٹی بخش نے جیسے ماں کی بات سنی ہی نہیں ”میں انہیں نہیں پھرڑوں گا۔“ میں بدلہ ضرور لوں گا۔“

”ہائے“ میں نے کہا، یہ خیال دل سے نکال دے۔“ اس بار باپ کا لہجہ بہت سخت تھا۔

”نہیں ابا۔ میں نہیں پھرڑوں گا انہیں۔ آج تو تم نے مجھے روک دیا لیکن میں۔“

باپ کا ہاتھ اٹھا لیکن ماں نے اسے روک دیا۔ وہ اسے معذورانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ پتھر اٹھا کر انہیں مارنے والا تھا۔ وہ تو میں پہنچ گیا ورنہ غضب ہو جاتا۔“

الٹی بخش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا غضب ہو جاتا۔ انہوں نے اس کا خون نکالا تھا۔ وہ پتھر مارتا تو ان کا بھی خون بہتا۔ اس میں غضب کی کون سی بات تھی۔

”تم اسے پیار سے سمجھاؤ نا“ ماں نے بہت دھیرے سے کہا۔ باپ کی سمجھ میں بات آگئی۔ سختی سے تو نفرت پیدا ہوئی تھی

اور پھر وہ ہر وقت، ہر بل تو اس کی چوکیداری نہیں کر سکتا تھا۔ پیار سے سمجھانے ہی میں بہتری تھی۔ اس نے الٹی بخش کو سمجھنے کر پینے سے لگایا، خوب پیار کیا اور پھر اسے گود میں بٹھالیا ”دیکھ میرا بیٹا تو پہلے دودھ پی لے پھر میں تجھے سمجھاؤں گا۔“

پھرے ہوئے شیر جیسا الٹی بخش باپ کے بوسوں سے بھیگ کر ایک دم بکری بن گیا۔ دودھ پینے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن باپ کے اصرار پر اس نے پی لیا۔ ماں خالی پیالہ واپس لے گئی تو

باپ نے بات شروع کی ”دیکھ بیٹے“ یہ باجی لوگ ہیں نا، یہ ہمارے پیارے نبیؐ کی اولاد ہیں۔ اور پیارے نبیؐ پر جان مال اور اپنا سب

تجھ قربان کر دیتا ہم پر فرض ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد ان سے محبت کرنا ہے۔ تو سمجھ رہا ہے نا؟“

الٹی بخش نے سر کو تقیسی جنبش دی۔ یہ تو وہ اب تک سمجھ چکا تھا۔ باپ اسے یہ باتیں بہت پہلے سے سمجھاتا رہا تھا۔

”تو باجی لوگوں کی اور ان کی اولاد کی عزت کرنا، ان سے محبت کرنا ہمارا فرض ہے۔“

”چاہے وہ ہمارے ساتھ زیادتی کریں؟“ الٹی بخش نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔“ باپ نے معکم لہجے میں کہا ”ہم عزت کریں تو کلن سا کمال ہوگا۔ ہاں زیادتی سہہ کر بھی ان کی عزت کریں تو اللہ

بک خوش ہوگا اور اس کا رسولؐ بھی۔ اور اللہ خوش ہوگا تو انعام نکالے گا۔“

”اے باجی لوگوں کو پولیس بھی نہیں پکڑ سکتی؟“ الٹی بخش کے معصوم ذہن نے ایک اور سوال اٹھایا۔

”تو ان چکروں میں نہ پڑ بیٹے۔ ہمیں تو صرف اپنی دیکھنی چاہیے۔ دنیا کی باتیں دنیا جانے۔ ہم تو بس نبیؐ کی اولاد کے خادم

ہیں۔ اب تو سوچ کہ ان پر ہاتھ اٹھائیں گے تو گستاخی ہوگی نا۔ اسی لیے میں نے تیرا ہاتھ پکڑا تھا۔ دیکھ بیٹے“ اللہ اور اس کے رسولؐ کو کبھی ناراض نہ کرنا۔“

الٹی بخش خاموش بیٹھا رہا۔ بات اب بھی اس کے حلق سے نہیں اتری تھی۔

”وعدہ کر کہ اب کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ بدلہ لینے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا۔“

الٹی بخش ہچکچاتا رہا۔ وہ اپنے دل کو نڈل رہا تھا، جس میں سختی ہی سختی تھی پھر اچانک ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ اس کے ننھے

سے دل میں درگزر کی نئی پھوٹی اور لمحوں میں جیسے پتھر موم ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے ابا۔ پھر میں انہیں معاف کر دیتا ہوں۔“

باپ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی ”یہ بھی گستاخی ہے بالکل۔ ایسی بات زبان پر نہیں لاتے۔ دل میں بھی نہیں سوچتے۔ بس بات ختم کر دیتے ہیں۔“

باپ کے لہجے کی سختی نے اسے ڈرا دیا ”ٹھیک ہے ابا“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اس وقت وہ چھوٹا تھا۔ اسے بحث کرنی نہیں آتی تھی۔ بڑا ہوا تو وہ بحث کرنے لگا۔ اس کا باپ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن جواب دینے اسے خوب آتے تھے۔ اس کے پاس وہ دانش تھی جو صرف عشق سے آتی ہے۔

ایسی ہی ایک بحث کے دوران الٹی بخش نے کہا ”ابا“ یہ سادات کچھ کرتے ہوئے اپنے نام اور نسب کا لحاظ کیوں نہیں کرتے؟“

باپ نے نظریں اٹھا کر اسے گھورا ”کیا مطلب ہے تیرا؟“

”میں یہ کہہ رہا ہوں ابا کہ زیادہ تر ان کا عمل لائقِ احترام نہیں ہوتا۔ وہ برے کام کیوں کرتے ہیں، برائی میں کیوں ملوث ہوتے ہیں؟“

”دیکھ بیٹے۔ آدمی اپنے اعمال پر نظر رکھے تو اسے کبھی دوسروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ تو اپنے

اعمال پر نظر رکھا کر بیٹے۔ قیامت کے دن اللہ سے یہ کہے گا کہ مجھ سے زیادہ گناہ تو فلاں شخص نے کیے تھے۔ دیکھ، حساب تو آدمی کو

صرف اپنا دنا پڑے گا۔“

ایک اور موقع پر الٹی بخش نے کہا ”ابا۔۔۔ تم عشق کی بات بہت کرتے ہو۔ کہتے ہو، زندگی کا مقصد عشق ہونا چاہیے۔۔۔ عشق

اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے۔ یہ تو بتاؤ، یہ عشق کیا چیز ہے۔

مشکل ہے کہ آسان ہے۔ مجھے تو محبت بہت آسان لگتی ہے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہو جاتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی مگر اعراض مسئلہ تو نہیں لگتا یہ بہت آسان ہے بناتے ہو۔“

باپ کے چہرے پر زری عی زری بکھر گئی۔ آنکھوں میں جیسے گہری سوچ اتر آئی ”میں تو جاہل آدمی ہوں بیٹے پر آپ ہی آپ یہ باتیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اس کے سمجھنے کے لیے کتابیں پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ عشق تو آدمی کے اندر ہوتا ہے نا۔ بس اس کے لیے خود کو سمجھنا اور تبدیل کرتے رہنا ہوتا ہے“ وہ کہتے کہتے رکا اور بظاہر سامنے والی دیوار پر کچھ دیکھنے لگا لیکن لگتا تھا کہ وہ بہت دور دیکھ رہا ہے ”عشق تو بیٹے آسان ہے۔۔۔ بہت ہی آسان۔ یہ تو ہو جاتا ہے۔ پر عشق کرتے رہنا، عشق کیے جانا بہت مشکل ہے۔ عشق کے تقاضے پورے کرنا بالکل آسان نہیں۔ اس کے لیے تو اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔“

”تم ہمیشہ مجھے اللہ اور رسولؐ سے عشق کی نصیحت کرتے ہو ابا۔ تم خود بھی تو کرتے ہو نا؟“

”ہاں کرتا ہوں“ باپ نے گہری سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا ”لیکن جیسے کرنا چاہیے ویسے نہیں کر پاتا۔ بس خلوص سے، سچے دل سے کوشش کیے جاتا ہوں۔“

”پر یہ کیسے ہوتا ہے ابا۔ اس سے عشق کیسے ہو سکتا ہے جسے دیکھا ہی نہ ہو۔“

”بیٹے اپنے وجود سے غور کرنا شروع کر۔ پیدا ہوا تو تو کبیرے جیسا تھا۔ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ اپنی حفاظت نہ زندگی کا اہتمام۔ رب نے تیری حفاظت کی۔ تجھے پالا تجھے دو ہاتھ دیے، دو ٹانگیں دیں۔۔۔ کام کرتی ہوئی۔ دو آنکھیں دیں۔ بینائی دی، عقل دی۔ تجھے ایک مکمل انسان بنایا۔ کوئی کمی کوئی عیروبی تیرے لیے نہیں چھوڑی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تجھے مسلمان کے گھر پیدا کیا تاکہ تجھے حق کی تلاش میں بھٹکانا نہ پڑے۔ یہ سب احسان اس نے تجھ پر کیے جو بے نیاز ہے جسے کسی سے غرض نہیں۔ اسے کسی سے کچھ نہیں چاہیے۔ اور اتنے احسانوں کے بعد اس نے بھلائی کا راستہ دکھا کر تجھ پر احسان کیا۔ اب یہ بتا کہ جواب میں تو کیا کرے گا؟“

الٹی بخش کچھ دیر سوچتا رہا۔ سوال مشکل تھا۔ سوچتے سوچتے ذہن منتشر ہوا جا رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا تھا میں اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ نماز پڑھوں گا، عبادت کروں گا، اس کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلوں گا، اس کا شکر ادا کروں گا۔“

”یہ بھی تو اللہ کا احسان ہو گا تجھ پر“ باپ نے کہا ”اس لیے کہ یہ سب کچھ کرنا تیرے ہی لیے فائدہ مند ہو گا۔ پھر بتا کہ تو نے کیا کیا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ یاد رکھ، توفیق بھی اللہ ہی دیتا ہے۔“

”تو اور میں کیا کر سکتا ہوں؟“ الٹی بخش نے بے بسی سے کہا۔ ”محبت کر۔ محبت کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ اللہ کی غلامی تو فرض ہے۔ اس کا حکم بجالانے میں تو اپنی ہی فلاح ہے۔ ہاں محبت اس کے لیے ہے، سمجھا کچھ؟“

”سمجھ تو گیا ابا۔ پر محبت کی تو نہیں جانتی ہو جاتی ہے۔“

”ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن محبت بھی بے سبب کبھی نہیں ہوتی۔ کبھی یہ ہمدردی کی وجہ سے ہوتی ہے، کبھی اس کا سبب کوئی خواہش ہوتی ہے، کبھی آدمی محبت کی طلب میں محبت کرتا ہے، یہ سوچ کر کہ اسے جواب میں محبت ملے گی۔ اور کبھی آدمی کسی کے احسانات کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ تیرے پاس محبت کا سبب تو موجود ہے۔ محبت کا سامان تو کر۔“

”کیسے کروں ابا؟“

”ہر وقت خدا کے احسانات یاد کیا کر۔ غور کیا کر کہ ہر سانس خدا کی عنایت ہے۔ یوں دل میں شکر گزاری پیدا ہوگی۔ پھر تو بے بسی محسوس کرے گا کہ اتنے احسانات کا شکر کیسے ادا کیا جاسکتا ہے۔ وہ بے بسی تیرے دل میں محبت پیدا کرے گی۔ تو سوچے گا کہ مالک نے بغیر کسی غرض کے تجھے اتنا نوازا۔ تجھ سے محبت کی۔ غور کر کہ اتنی بڑی دنیا میں، کروڑوں انسانوں کے بیچ تو کتنا حقیر ہے۔ سیکڑوں کے مجمع میں بھی تیری کوئی پہچان نہیں۔ کوئی تجھ پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالے گا۔ کسی کو پروا نہیں ہوگی کہ کوئی الٹی بخش بھی ہے لیکن تیرا رب کروڑوں انسانوں کے بیچ بھی تجھے یاد رکھتا ہے، تیری ضروریات پوری کرتا ہے، تیری بہتری سوچتا ہے اور تجھے اہمیت دیتا ہے۔ ان سب باتوں پر غور کرتا رہے گا تو تیرے دل میں خدا کی محبت پیدا ہوگی۔ اس محبت کے ساتھ بھی یہ سب کچھ سوچتا رہے گا تو محبت میں گہرائی پیدا ہوگی اور پھر تجھے خدا سے عشق ہو جائے گا۔“

”لیکن ابا، اللہ سے محبت کا طریقہ کیا ہے؟“ الٹی بخش نے پوچھا ”کیا اس سے یہ کہتا رہوں کہ مجھے تجھ سے محبت ہے؟“

”یہ تو انسانوں سے کہنا پڑتا ہے کیونکہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ لیکن اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اس سے دل کا حال چھپا نہیں۔ صرف محبت کرتے رہو۔ وہ جان لے گا۔ جہاں تک طریقے کا تعلق ہے تو ہم جیسے حقیر بندوں کے لیے اس نے فرمایا ہے کہ مجھ سے محبت کرنی ہے تو میرے بندوں سے محبت کرو یعنی بغیر کسی غرض کے ہر انسان سے صرف اس لیے محبت کرو کہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے“ باپ کہتے کہتے رکا اور مسکرا دیا ”اب تو سمجھ رہا ہے نا۔ اللہ کو اپنے آخری رسولؐ خاتم الانبیاء سے خاص محبت ہے۔ بے پناہ محبت ہے۔۔۔ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں تو ہم پر عشق رسولؐ بھی لازم ہوتا ہے۔ عشق نہ کیسے رکھتا ہے نہ کبھی ختم ہوتا ہے۔“

”اور رسولؐ سے عشق ہم کیسے کریں گے؟“

”ہم نے اللہ سے محبت کی تو ہمیں اس سے عشق تو کرنا پڑے
 ہاں جو اللہ کو سب سے پیارا ہے اور اس سے عشق کرنے کے لیے
 ہیں اس کا احترام کرنا ہوگا۔ اسے درود بھیجتے رہو۔ اس کے اسم
 مبارک پر احتراماً کھڑے ہو جاؤ۔ اس کی سنت طیبہ کی پیروی کی
 کوشش کرو اور آخری بات یہ اصول کہ جو بھی اسے پیارا ہو اسے
 اپنی جان سے پیارا سمجھو۔ اسی بنیاد پر تو ہم اللہ کے عشق سے
 رسول کے عشق تک پہنچے ہیں۔“

الہی بخش نے سر کو تھمسی جنبش دی۔ بات اب اس کی سمجھ
 میں آ رہی تھی۔

”اب یہ بتا کہ انسان کو سب سے پیارا کون ہوتا ہے؟“ باپ
 نے سوال اٹھایا۔

”اپنے ماں باپ“ الہی بخش نے بلا جھجک کہا۔
 ”ٹھیک کہا تو نے“ باپ مسکرایا ”لیکن جس چیز کا تجربہ نہیں
 ہے وہ تو کیسے کہہ سکتا ہے۔ وہ میں تجھے بتاتا ہوں۔ ماں باپ کے
 علاوہ انسان کو اولاد سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ یہ تو خود اللہ
 نے ہمیں بتایا ہے۔“
 ”کیسے ابا؟“

”حضرت ابراہیمؑ اللہ کے بہت عظیم عاشق تھے۔ آپ سے
 اللہ تعالیٰ نے عزیز ترین چیز کی قربانی طلب فرمائی اور آخر میں ثابت
 ہوا کہ وہ آپ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ تھے۔“
 ”ٹھیک ہے ابا۔“

”تو ہم پیارے رسولؐ سے عشق کرنا چاہیں تو ضروری ہوا تاکہ
 ان کی اولاد کو اپنی جان سے زیادہ چاہیں۔ اور یہ باقی لوگ رسولؐ کی
 اولاد ہیں بیٹے۔“

الہی بخش حیران رہ گیا۔ اس کا باپ زیادہ بولنے والا نہیں تھا۔
 وہ تو بہت کم بات کرتا تھا۔ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ مگر کہاں سے
 گھما پھرا کر اسے اپنے مطلب کی بات تک لے آیا تھا۔ بات مدلل
 تھی لیکن الہی بخش کے دل اور ذہن نے قبول نہیں کی۔ وہ سوچ رہا
 تھا کہ وہ اللہ اور رسولؐ سے بلا واسطہ عشق بھی تو کر سکتا ہے لیکن یہ
 بات اس نے ابا سے نہیں کہی۔ وہ اور لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں
 تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ میں اولادِ نبیؐ پر اپنی جان بڑی آسانی سے
 قربان کر سکتا ہوں“ باپ نے کچھ توقف کے بعد کہا ”لیکن میری دعا
 ہے کہ کبھی وقت آئے تو میں اولادِ رسولؐ پر اپنی اولاد بھی قربان
 کر سکوں۔ مگر جانتا ہوں کہ اس کے لیے بڑا دل چاہیے اور وہ اللہ
 عطا کر سکتا ہے۔“

اس آخری جملے نے الہی بخش کو اور باغی بنا دیا۔ اسے احساس
 اُسے لگا کہ باپ اس سے محبت نہیں کرتا اور قربانی کے جانور سے
 زیادہ اس کی وقعت بھی نہیں ہے۔ اسے لفظ عشق سے ہی چڑ

ہو گئی۔ وہ سادات سے بچنے لگا۔ ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتا تو اس
 نے بچپن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس گفتگو کے چند ماہ بعد ہی وہ واقعہ پیش آگیا۔ پہلے تو اسے
 ایسا لگا کہ ابا کی دعا قبول ہو گئی ہے لیکن بہر حال وہ غصہ کیا۔ زندہ رہا،
 البتہ سر سے پیشانی کے وسط تک زخم کا وہ بد نما نشان اسے اب بھی
 اس واقعے کی یاد دلاتا اور بے دقتی کا احساس جگاتا تھا۔

اس واقعے کے بعد اس نے باپ سے کہا ”ابا! میں کراچی
 جانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”کراچی میں روزگار بہت ہے ابا۔ یہاں سے اچھائی رہوں گا
 وہاں۔“

”تیری مرضی بیٹے“ باپ نے مختصراً کہا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹا
 ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میٹرک تک پڑھنے کے بعد الہی بخش نے تعلیم کو
 خیر یاد کہہ دیا تھا اور روزگار کی فکر میں لگ گیا تھا۔ ہزارے میں
 روزگار کی بڑی فکر تھی کیونکہ روزگار تھا ہی نہیں۔ زیادہ تر لوگ
 اس سلسلے میں باہر ہی جاتے تھے۔ کچھ ملک کے بڑے شہروں میں اور
 کچھ ملک سے باہر۔ اجازت دینے کے سوا وہ کیا کرتا؟

مگر الہی بخش کا مسئلہ روزگار نہیں تھا، وہ تو باپ کے عشق سے
 گھبرا کر بھاگ رہا تھا۔ وہ رنگ و روغن کا کام جانتا تھا اور اس کا
 اچھا کارگیر تھا۔ کام بھی ٹھیک ٹھاک مل جاتا تھا اس لیے کہ وہ
 ایمان دار بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ آخر میں وہ ایمان داری ہی اس
 کے لیے جان لیوا ثابت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ لیکن اس دن کے بعد
 سے وہ باپ کے عشق سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے لیے فرار ہونے
 ہی میں عافیت تھی۔

یہ الگ بات کہ عشق نے کراچی میں بھی اس کا پیچھا نہیں
 چھوڑا۔ اسے کراچی آئے ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ
 خود عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر وہ عشق باپ کے عشق سے بالکل مختلف
 تھا۔

الہی بخش کو کراچی بہت پسند آیا۔ اس لئے کہ وہاں نام و
 نسب سے کسی کا کام نہیں چلتا تھا۔ وہاں آدمی کی شناخت اس کے
 کام، اس کے ہنر سے ہوتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے یہ خوش
 گوار احساس ہوا کہ اس کی اپنی بھی ایک شناخت ہے۔ اور وہ اس
 شناخت سے بالکل مختلف ہے جو اس پر تھوپ دی گئی تھی۔ کراچی
 میں وہ جلاہوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے جلاہا نہیں تھا۔ وہ الہی
 بخش تھا۔ رنگ ساز الہی بخش!

کراچی میں اسے دو مقام بہت زیادہ پسند آئے۔ ایک فیڈرل بی
 ایریا کے وائرلپ کے چورنگی اور دوسرا طارق روڈ پر کینے لبرٹی کی
 چورنگی۔ اس کا بس چلتا تو وہ دونوں مقامات اپنا لیتا۔ لیکن یہ ممکن
 نہیں تھا۔ اسے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ بہت سوچ
 بچار کے بعد اس نے کینے لبرٹی کی چورنگی کے حق میں فیصلہ کیا۔ ایک

وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے لوگوں کا علاقہ تھا۔ دوسری یہ کہ وہاں رونق بہت ہوتی تھی۔ وہ علاقہ اسے بھاگیا تھا۔

بعد میں زندگی بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ اگر وہ کینے لہٹی کے بجائے وائپرپ پر بیٹھا تو اس کی زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ نہ وہ جلائے عشق ہوتا اور نہ اس کی زندگی غمِ عشق ہوتی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ معمولی سے فیرا ہم سے فیصلے زندگی پر کتنے بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ فیصلے کا اختیار تو تو ہی کو ہوتا ہے لیکن وہ فیصلہ اپنی تقدیر کے مطابق ہی کرتا ہے۔ فیصلہ وہ کرتا ہے لیکن مرضی اوپر والے کی ہوتی ہے۔

کراچی میں محنت کے بازار جا بجا لگتے ہیں۔ ہر علاقے کا اپنا ایک بازار محنت ہے۔ کینے لہٹی کے آگے کی سمت بالکل مقابل جو نیلرزی کی ایک دکان ہے۔ اس کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بھی ایسا ہی ایک بازار ہے۔ علاقے میں کسی کو کسی بھی نوع کی کسی خدمت کی ضرورت ہو تو وہ اس بازار کا رخ کرتا ہے۔ اس بازار میں ہر طرح کی محنت انسانی دکانوں میں انسانی شوکیسوں میں یوں بھی ہوتی ہے کہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس جاؤ اور خرید لو۔ فٹ پاتھ پر بھی ہوئی یہ انسانی دکانیں اپنے شوکیس سمیت بمشکل دو فٹ جگہ گھیرتی ہیں۔ کہیں کوئی بیچلے مگدال یا چاؤ ڈا نظر آئے تو سمجھ لیں کہ وہاں مزدور دستیاب ہے۔ پینٹ کے ڈبے پر برش اور رنگوں کا کارڈ نظر آئے تو وہ رنگ و روغن والا ہے۔ خالی کنسٹرکٹور کوچی رکھی ہو تو چونا کرنے والا ہے۔ پلمبنگ کے اوزار پلمبر کا پتا دیتے ہیں۔ کوئی شخص کرنی اور فرش بنانے والا تختہ لئے بیٹھا ہو تو راج مستری ہے۔ اور جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو بس ایک لمبا سا میلہ سا کپڑا کندھے پر ہو تو سمجھ لیں کہ وہ بوجھ ڈھونے والا مزدور ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی شناخت اس کے شجرہ نسب سے نہیں اس کے اوزاروں سے اس کے ہنر سے ہوتی ہے۔

الٹی بخش کو یہی بات پسند آئی تھی۔ اس نے پینٹ کا ایک خالی ڈبا، کلر کارڈ اور اپنے برش لئے اور اس فٹ پاتھ پر محنت کا انسانی شوکیس بن گیا۔ ڈیڑھ دو فٹ جگہ میں وہ بھی سج بن کر بیٹھ گیا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ زندگی سے خوش تھا۔

جلد ہی زندگی معمولات کی ڈگر پر چل پڑی۔ ایبٹ آباد سے وہ سات لڑکوں کے ساتھ آیا تھا۔ ان آنکھوں نے مل کر اعظم ہستی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ کرایہ سو روپے تھا۔ بجلی کا بل ملا کہ ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ میں روپے دینے ہوتے تھے۔ گھر سے وہ لوگ زیادہ پیسے نہیں لائے تھے۔ انہوں نے چار پائیاں خریدیں۔ موسم ایسا تھا کہ فی الحال بستر کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا وہ باہر کھاتے تھے۔ لہذا برتنوں کا جھیلہ بھی نہیں تھا۔ زندگی آسانی سے شروع ہو گئی۔ پھر سب سے اچھی بات یہ تھی کہ سب کو فوراً ہی روزگار بھی مل گیا۔

الٹی بخش کے لئے یہ تجربہ بھی اٹکا تھا کہ وہ ہندس میں تھا لیکن ایک منٹ کے لئے بھی اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

یہاں تک کہ وہ فٹ پاتھ پر آکر بیٹھا تو پہلے ہی دن اسے کام مل گیا۔ کام بھی ایسا کہ چار دن اسے کام کے سوا کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ وہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ بعض اوقات کئی کئی دن خالی بیٹھے بھی گزر جاتے ہیں۔ پہلی بار اس نے جس کے ہاں کام کیا تھا، وہ اس کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اسے دس روپے انعام بھی دیا۔ اس آغاز کے بعد کبھی یہ نوبت نہ آئی کہ اس کی جیب خالی رہی ہو۔ ابتدا میں تو الٹی بخش کو اپنا شہر بہت یاد آیا۔ وہ ہمیشہ سوچتا کہ ایبٹ آباد جیسا خوب صورت اور سرسبز علاقہ دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ ایسے سادہ اور پُر امن لوگ کہیں ہو ہی نہیں سکتے۔ اور ایسا موسم اور آب و ہوا کہیں نہیں ملے گی۔ بات ٹھیک ہی تھی۔ لیکن اسے اندازہ نہیں ہوا کہ کراچی کس طرح اس کے دل میں گھر کر رہا ہے۔ وہ تو ایک دن اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے کراچی سے محبت ہو گئی ہے۔ اس نے دل کو ٹٹولا تو پتا چلا کہ اس محبت نے اس کے دل کی گہرائی میں جڑیں پکڑی ہیں۔ غور کیا تو ثابت ہوا کہ کراچی اس محبت کا مستحق ہے۔

الٹی بخش کراچی کے متعلق سوچتا تو اس کا وجود احساسِ شہر گزاری سے سرشار ہو جاتا۔ اس کے ذہن میں غریب پرور شہر برکتوں کا شہر، خدا کی رحمتوں کا مرکز جیسے عنوان کو غنچے لگتے۔ کراچی کے لوگ بہت اچھے تھے۔ فراخ دل، محبت کرنے والے اور پُر سکون۔ الٹی بخش ایسے کتنے ہی لوگوں سے مل چکا تھا جو بغیر ٹکٹ کے ریل میں چھپتے چھپاتے سفر کرتے کراچی پہنچے تھے اور ان کی جیبیں خالی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے باوجود انہیں کبھی بھوکا نہیں سونا پڑا تھا۔ کسی کو اسٹیشن کی حدود میں ہی روزگار مل گیا تھا اور کسی کو شہر پہنچ کر۔ روزگار کی فراوانی تھی۔ کھانے پینے کا بھی یہ تھا کہ ایک روپے میں بھی پیٹ کی آگ بجھائی جاسکتی تھی۔ سونے کا ٹھکانا میسر نہ ہوتا تو لوگ پارکوں، باغیچوں میں بھی سو لیتے تھے۔ کھانا آسان انہیں تحفظ فراہم کرتا تھا۔ اب ایسے شہر سے کوئی محبت کئے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی سے چلے جانے کے بعد بھی کراچی کے مسمان اس شہر سے محبت کرتے تھے، اسے یاد رکھتے تھے۔ آج بھی دیکھ لیں، ملک کے ہر بڑے، چھوٹے شہر میں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں کراچی کے نام کی کوئی دکان، کوئی ہوٹل ضرور ملے گا۔ جو ایک بار کراچی رہ گیا، اس نے اس شہر کے نام کو اپنی خوش بختی کی علامت ضرور سمجھا۔

سو کراچی آتے ہی الٹی بخش محبت سے آشنا ہو گیا ورنہ وہ تو عشق اور محبت سے خوف زدہ تھا۔

الٹی بخش نے انگریزی زبان کا یہ مقولہ سنا بھی نہیں تھا کہ صبح سویرے رزق کی تلاش میں نکلنے والے پرندے کو کھانے کے لئے سب سے زیادہ کیرے ملتے ہیں مگر وہ تھا بہت سویرے اٹھنے والا پرندہ۔ اور سویرے اٹھ کر گھر میں وقت ضائع کرنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ گھر میں دل لگانے کا کوئی سامان تھا بھی نہیں۔ چنانچہ وہ تیار ہو کر باہر نکلا، ہوٹل میں ناشتا کرتا اور محنت کا بازار نکلنے سے

پلے ہی بازار پہنچ جاتا۔ وہاں اس کے لئے طمانیت ہی طمانیت تھی۔ ڈیرہ دھن کی وہ جگہ اسے ملکیت کا احساس دلاتی تھی۔ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ صاحب جائیداد ہے۔ وہ اکیلا اپنے ٹھکانے پر پہنچتا۔ پنٹ کے خالی ڈبے رکھ کر وہ اپنی دکان سجاتا۔ پھر پاؤں پھیلا کر بیضاہ گرد پیش کی ویرانی دیکھتا رہتا۔

ج پوچھو تو وہ وہاں اتنی صبح صرف اداس ہونے کے لئے آتا تھا۔ البتہ اسے اس بات کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ سنان رکیں بند دکانیں اور سوئے ہوئے فلیٹ دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا۔ اسے یقین ہی نہیں آتا کہ شام اسی جگہ اتنی چل پھل تھی کہ فٹ پاتھ پر کسی نہ کسی سے ٹکرائے بغیر چلنا ہی ممکن نہیں تھا۔ اتنی گاڑیاں سڑک پر تھیں کہ بعض اوقات ٹریفک آدھا آدھا گھٹنا جام رہا تھا۔ ہارنوں کا، لوگوں کا ایسا شور تھا کہ خاموشی کی طلب ہونے لگتی تھی۔ دکانوں پر اتنی بھیڑ تھی کہ لگتا تھا کہ ہر چیز مفت بائیں باری ہے اور اب... اب اتنا سنا! کوئی بھولی بھلی گاڑی سامنے سے گزر جاتی تو لگتا کہ سناٹے کا شیشہ چھن سے ٹوٹ گیا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر الٹی بخش کو ایٹ آباد یاد آنے لگتا۔ ایٹ آباد نہیں، وہاں کا موسم خزاں۔ جب ٹڈ منڈ درختوں کو دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ درخت مر گئے ہیں۔ وہ جانتا تھا لیکن پھر بھی اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ درخت پھر رہے ہوں گے۔ نئی کوئلیں پھونکیں گی۔ شاخوں پر نئے نئے ٹکلیں گے۔ ہر سال وہ یہ عمل دیکھتا گرد درختوں کو خزاں رسیدہ دیکھتا تو یقین نہ آتا کہ یہ موت عارضی ہے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ وہ بدترین اور تھمائی مایوس کن صورت حال میں بھی پُر امید رہتا تھا۔ کیونکہ ہر سال کے بعد اس نے بہار آتے دیکھی تھی۔

کراچی میں موسم کی وہ کرشمہ کاریاں تو نہیں تھیں لیکن اس کا بادل اسے صبح کی ویرانی کی شکل میں مل گیا تھا۔ یہاں لوگ دیر تک سوتے تھے۔ صبح نو بجے تک تو ہر طرف سنا رہتا۔ پھر جیسے زندگی ابھرنی لے کر بیدار ہوتی۔ دس بجے سے چل پھل شروع ہو جاتی۔ شام کو رونق اپنے شباب پر ہوتی۔ ایسی رونق ہوتی کہ وہ وحش کے باوجود صبح کی ویرانی کا تصور بھی نہ کر پاتا۔ لگتا جادو کے دور سے سب بدل گیا ہے۔

اس کے نزدیک یہ کراچی کے بہار و خزاں تھے۔ ایٹ آباد میں خزاں تین مہینے رہتی تھی اور سال میں ایک بار آتی تھی۔ یہاں خزاں ہر روز آتی تھی اور دس گھنٹے کے لئے آتی تھی۔ وہاں خزاں کے درختوں پر آتی تھی جبکہ یہاں رونقوں کے درخت خزاں کی ٹڈ منڈ ہو جاتے تھے۔ مگر یہاں کی خزاں کے تین گھنٹے وہاں کی خزاں کے تین ماہ سے زیادہ کرب ناک تھے۔ وہاں تو وہ خزاں رسیدہ درختوں کے دکھ میں شریک رہتا تھا۔ تھمائی کا احساس تو نہیں ہوتا تھا مگر یہاں اسے لگتا کہ کسی نے جادو کے زور پر ہر انسان کو ہر چیز کو ہر کامنا ہوا ہے۔ اور پھر کی عمارتوں میں مجسمے قید ہیں۔ اسے تھمائی کا احساس ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ پوری کائنات میں خدا کے

اور اس کے سوا کوئی موجود نہیں۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ تھمائی اسے خوف زدہ نہیں کرتی تھی بلکہ سوچنے پر اکساتی تھی۔ دنیا کی بے ثباتی اس پر بالکل واضح ہو جاتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ نیند عارضی موت ہوتی ہے۔

تویوں ہر صبح الٹی بخش اداسی سے اپنے دن کا آغاز کرتا۔ وہ بیٹھ کر زندگی، موت اور موسموں کے بارے میں سوچتا رہتا اور اچانک اسے احساس ہوتا کہ اس استغراق کے عالم میں اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کسی نے جادو کی چھری گھمائی ہے اور دنیا پھر سے زندہ ہو گئی ہے۔

دن گزرے تو ساتھ بیٹھنے والے مزدوروں سے دوستی بھی ہو گئی۔ وہ سب ایک فیملی کی طرح تھے۔ کبھی جھگڑے بھی ہوتے لیکن سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے۔ اس طرح ساتھ رہنے میں ایک اچھی بات پیدا ہو گئی تھی۔ ان کا عقیدہ درست ہو گیا تھا۔ اس بات پر ایمان پختہ ہو گیا تھا کہ جس کو جتنا رزق ملتا ہے اتنا ہی ملے گا اور کوئی کسی کا حق نہیں مار سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی پنٹ والے کو کام ملتا تو دوسرے کارنگر اس سے حسد نہ کرتے۔ یہ نہ سوچتے کہ وہ نہ ہوتا تو شاید کام انہیں مل جاتا۔

الٹی بخش کو بوجھ ڈھونے والے مزدوروں میں خاص دلچسپی تھی۔ وہ چیونٹیوں کی سی فطرت رکھنے والے تھے۔ مل کر گروہ کی صورت میں کام کرتے۔ وہاں چھ مزدوروں کا ایک گروپ تھا۔ الٹی بخش جانتا تھا کہ ان لوگوں کا کام بہت سخت ہے۔ فرنیچر کی دکان سے بھاری فرنیچر ٹرک پر لدوانا۔ پھر اس سامان کو منزل پر پہنچا کر مرضی کی جگہ پر رکھنا۔ بعض اوقات انہیں سامان چوتھے مالے تک پہنچانا پڑتا۔ کوئی شخص مکان تبدیل کرتا تو اسے ان مزدوروں کی ضرورت پڑتی۔ کام دو گھنٹے میں ختم یا دس گھنٹے میں، دھاڑی وہ پورے دن کی لیتے۔ کام ایسا تھا کہ وہ تھکن سے چور ہو جاتے۔

انہیں دیکھ کر الٹی بخش کو یا تو چیونٹیوں کا خیال آتا تھا یا شہد کی مکھیوں کا۔ کم از کم اس گروپ میں جس سے وہ واقف تھا، تنظیم بھی تھی اور ڈسپلن بھی تھا۔ گروہ کا سردار وہ ہوتا تھا جس کی عمر سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کی بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بھی سب سے کم ہوتی تھی۔ وہ ہاتھ ضرور بٹاتا تھا لیکن اس کے ساتھی اسے زیادہ بھاری سامان اٹھانے نہیں دیتے تھے۔

وہیں الٹی بخش کو یہ علم ہوا کہ بوجھ اٹھانے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اسی لئے زیادہ عمر والے کو سردار بنایا جاتا تھا۔ لیکن اصل سردار سب سے کم عمر لڑکا ہوتا تھا جو سب سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کو تحفظ فراہم کرتا تھا۔ سب سے بھاری سامان وہ اٹھاتا تھا۔ چار پانچ سال میں وہ عام مزدوروں کی طرح ہو جاتا تھا اور گروپ کو اس کا متبادل تلاش کرنا ہوتا تھا۔ سردار سے لے کر تمام عام مزدور اس مرحلے سے گزر چکے ہوتے تھے۔

اس سے الٹی بخش کو ان کی تنظیم کا اندازہ ہو گیا۔ وہ تو باقاعدہ

ایک ادارہ ساتھ۔ مزدور جیسے جیسے جسمانی تنزیل کی طرف بڑھتا تھا اس کا مرتبہ بھی بڑھتا رہتا تھا اور اس سے کام کم لیا جاتا تھا۔ اس کا احترام زیادہ ہوتا تھا۔ اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ وہ بوجھ اٹھانے کا پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ لمحوں میں حل کر دیتا تھا۔ پھر ایک وقت آتا تھا کہ سینئر مزدور کو رستار ہو جانا پڑتا تھا۔ قدرت کا نظام ایسا تھا کہ اس وقت تک اس کا پرنا بڑا ہو چکا ہوتا تھا۔ وہ ذمے داری سنبھال لیتا تھا۔ کچھ اور نہ کہتا تو اپنے باپ کے ہی گروپ میں کام سنبھال لیتا۔ اور کوئی مزدور بیٹے کا باپ نہ ہوتا یا اس کا بیٹا بہت چھوٹا ہو تو ساتھی مزدور اس کے لئے اتنا بندوبست کر دیتے کہ وہ کہیں بیٹھ کر پھل سبزی یا کوئی اور چیز بیچنے لگتا۔ اس کے بجائے گروپ میں نیا خون شامل کر لیا جاتا۔

اتنی بخش کو یہ سب جلد ہی معلوم ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گروپ کا سردار قاسم اس پر بڑا مہربان تھا۔ وہ اس پر غیر معمولی شفقت کرتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گروپ ان دنوں بحران کی زد میں تھا۔ انہیں گروپ میں شامل کرنے کے لئے نیا خون، نو عمر مزدور درکار تھا۔ قاسم بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب وہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ایک دن اتنی بخش نے قاسم سے پوچھا ”چاچا... تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”میں تمہیں اشارہ دے سکتا ہوں۔“ قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا ”حساب تمہیں ہی لگانا ہو گا۔ میں مزدوری کے سوا کوئی حساب نہیں لگا سکتا۔“

”چلو اشارہ ہی دے دو۔“

قاسم چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا ”پاکستان بنا تو میں پچیس سال کا تھا۔“

اتنی بخش حیران رہ گیا ”ارے تم صرف ۳۶ سال کے ہو۔“ اس کی حیرت بجا تھی۔ قاسم دیکھنے میں ساٹھ سال کا لگتا تھا۔

”بیٹا، یہ کام ہی ایسا ہے کہ آدمی کو اندر سے چاٹ لیتا ہے۔ کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اب تو مجھ سے بوجھ اٹھایا بھی نہیں جاتا۔ جیسے ہی کوئی نیا لڑکا ملے گا میں یہ کام چھوڑ دوں گا۔ زیادہ دیر ساتھیوں پر بوجھ تو نہیں بن سکتا۔“

اتنی بخش جانتا تھا کہ وہ لوگ کسی جوان لڑکے کی تلاش میں ہیں ”بچے تمہارے کتنے ہیں چاچا؟“ اس نے پوچھا۔

”جھل ابھی دور ہے۔“ قاسم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”میرا بیٹا ابھی صرف دس سال کا ہے۔“

اتنی بخش کو دکھ ہوا۔ مزدور کے لئے بچوں میں صرف بیٹے کی اہمیت تھی اور وہ بھی بڑے بیٹے کی۔ یعنی طور پر اس بڑے بیٹے سے بڑی قاسم کی کوئی بیٹی بھی ہوگی۔ بلکہ ممکن ہے بیٹیاں ہوں۔ لیکن وہ بتانا نہیں چاہتا تھا تو کہ یہ نا بھی مناسب نہیں تھا ”آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ بھی کر لوں گا۔ پھیری والا بن کر گھر گھر جاؤں گا لوگوں کی خدمت اب بھی کرتا ہوں جب بھی کروں گا۔“

اس گفتگو کے ایک ہفتے بعد بوجھ ڈھونے والے مزدوروں کو مطلب کا ایک لڑکا مل گیا۔ اس روز جشن کا سماں تھا۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ لیکن سب سے زیادہ خوش عباس تھا۔ عباس وہ لڑکا تھا جو اب تک گروپ میں سب سے کم عمر تھا۔ اتنی بخش اس کی خوشی کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عباس پچھلے پانچ سال سے سب سے زیادہ بوجھ اٹھاتا رہا ہے۔ وہ اب بھی جوان تھا لیکن اپنی عمر سے بہت بڑا لگنے لگا تھا۔ اور اب اسے ان پانچ برسوں کا صلہ ملنے والا تھا۔ اب بہت بھاری بوجھ اس کے لئے نہیں تھا۔ اس کی جگہ کسی اور نے لے لی تھی۔ اب آنے والے وقت میں اس کے لئے سختی کم سے کم ہوتی جانی تھی۔

نئے مزدور کا نام زرداد خان تھا۔ اس کی عمر مشکل سے انیس سال ہوگی۔ دیکھنے میں وہ بالکل جان دار نہیں لگتا تھا۔ اتنی بخش نے یہ بات قاسم سے بھی کہہ دی۔ قاسم باچھیں پھیلاتے ہوئے مسکرایا۔ ”ارے بیٹا وہ بہت شاندار لڑکا ہے۔“ وہ بولا ”لیکن تمہارے پاس مزدور کی آنکھ تو نہیں ہے نا۔ کام ملنے دو۔ پھر اس کے جوہر دیکھنا۔“ جاندار ہونہ ہو، نیا لڑکا مبارک بہر حال تھا۔ پہلے ہی دن انہیں کام مل گیا۔ ایک بڑی فیملی طارق روڈ سے ناظم آباد شفٹ ہو رہی تھی۔ سامان دوسری منزل سے اتارنا اور جو تھی منزل پر چڑھانا تھا۔ مزدور بہت خوش تھے۔

مزدور تیاریوں میں لگے ہوئے تھے کہ قاسم اتنی بخش کے پاس آیا ”کیا خیال ہے بیٹے۔ آج چھٹی کر سکتے ہو؟“ اس نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے چاچا۔ کوئی کام ہے؟“ اتنی بخش نے پوچھا۔

”کام تو نہیں۔ جی چاہتا ہے، آج کا دن ہمارے ساتھ گزاریو۔“

”ٹھیک ہے چاچا۔ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ میں چلوں گا تم لوگوں کے ساتھ۔“

”بات صرف کام کی نہیں۔ رات کا کھانا بھی میرے گھر کھاؤ گے۔ سب کے ساتھ۔“

”یہ بھی ہو جائے گا۔ اپنا کوئی گھر پر انتظار کرنے والا تھوڑا ہی ہے۔“ اتنی بخش نے بے فکری سے کہا۔

ٹوک آیا تو اتنی بخش بھی سب مزدوروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ صاحب خانہ انہیں دوسری منزل پر اپنے فلیٹ میں لے گئے۔ فلیٹ میں اتنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامان کاٹھ گہاڑ کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ لیکن اتنی بخش اندازہ کر سکتا تھا کہ گھر بدلنے کے ارادے سے پہلے اس سامان کے ساتھ یہ فلیٹ کیسا لگتا ہو گا۔ سچ یہ ہے کہ اس نے ایسا سامان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ قالین، صوفے، بیڈ، الماریاں، ٹی وی اور نجانے کیا کیا۔ تو گھرایسے بھی ہوتے ہیں۔ اس نے حیرت سے سوچا۔ اور گھروں میں سامان ایسا بھی ہوتا ہے۔

صاحب خانہ قاسم کو سامان دکھا رہا تھا ”یہ ان ڈبوں میں کاغذ کے برتن ہیں۔“ وہ اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا ”انہیں احتیاط سے اتارنا ہوگا۔“

”آپ بے فکر رہیں صاحب۔“ قاسم نے کہا ”ایک پیالی بھی نہیں ٹوٹنے کی اللہ کے حکم سے۔“

صاحب اس کی بات سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا ”اور یہ فرنیچر بالکل نیا ہے۔“ اس نے کہا ”خراش بھی نہیں پڑنی چاہئے کسی چیز پر۔“

”آپ فکر نہ کریں صاحب۔ جیسا آپ کا سامان ہے ایسا ہی اترے گا اور ایسا ہی چڑھے گا دوسرے مکان میں۔“ قاسم نے کہا۔ ”بس تو شروع کر دو۔“ صاحب نے حکم دیا۔

مزدوروں کے درمیان کوئی مشاورت نہیں ہوئی لیکن انہوں نے کام اس انداز میں شروع کیا جیسے سب کچھ پہلے ہی سے طے رہا ہو۔ بھاری فرنیچر نئے لڑکے کی ذمہ داری تھی۔ لکڑی کی ایک الماری بہت بھاری تھی۔ اس کے لئے قاسم نے صاحب کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس نے پوچھا ”صاحب یہ الماری کھلنے والی ہے؟“

”نہیں۔“ قاسم کو مایوسی ہوئی ”کھلنے والی ہوتی تو آسانی رہتی۔“ اس نے کہا۔

”تم لوگوں کے لئے یہ بڑا مسئلہ تو نہیں۔“ صاحب نے بے نیازی سے کہا۔

”وزن کی بات نہیں صاحب۔“ قاسم نے بے حد اعتماد سے کہا۔ ”لیکن زینے بہت تنگ ہیں۔ خراش لگ سکتی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔“ وہ نئے لڑکے زرداد کی طرف متوجہ ہو گیا ”بیٹے پہلے یہی اتار دے۔ عباس تیرا ساتھ دے گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں استاد۔“ زرداد بولا ”بس اسے میری پیٹھ پر لاد دو۔“

قاسم جواب میں کچھ کہنے والا تھا، مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ انہی بخش نے ایسے انداز میں کہ کسی کو محسوس نہ ہو، الماری کو کھسکانے کی کوشش کی۔ لیکن الماری بہت بھاری تھی۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ اکیلا زرداد خان اسے کمر پر اٹھا کر نیچے اتار دے گا۔

مزدوروں نے مل کر الماری زرداد کی کمر پر رکھ دی۔ ایک چادر کو مل دے کر الماری کے درمیانی حصے سے گزار کر زرداد خان نے اپنے پیٹ پر چادر کو گہ لگا دی۔ پھر وہ چل پڑا۔ تمام مزدوروں کے چہروں پر خوشی سنسار رہی تھی۔ ان میں سے دو زرداد کے آگے تھے اور باقی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی سامان نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں یقین نہیں تھا کہ زرداد الماری کو نیچے پہنچائے گا۔ کسی بھی وقت اسے ہنگامی طور پر مدد کی ضرورت ہوسکتی تھی۔ اور وہ سب اس کے لئے تیار تھے۔

الہی بخش کو قاسم کی مزدور کی نظر کا قائل ہونا پڑا!

زرداد کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ درمیان میں وہ کہیں ایک سائس کے لئے بھی نہیں رکا۔ الماری اس نے نیچے اتار دی اور پیشانی سے ہینڈ پونچھنے کے بعد بغیر کسی توقف کے زیروں کی طرف چل دیا۔ اب مزدوروں کے چہروں پر خوشی کے ساتھ اعتماد بھی تھا۔ وہ صحیح معنوں میں مکمل اٹھے تھے۔

اس کے ساتھ ہی کام کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ جسموں میں جیسے بجلیاں بھر گئیں۔ الہی بخش کو اپنی بے مصنی کا احساس ستا رہا تھا۔ تمام مزدور خاموشی سے کام میں لگ گئے تھے۔ کوئی سستی نہیں دکھا رہا تھا۔ کاغذ کے برتنوں والے ڈبوں کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ شاید قاسم کی ذمہ داری تھی۔

قاسم ایک کارٹن لے کر چلا گیا تو الہی بخش نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک کی نشست والے ایک صوفے کو ہلکا کر دیکھا۔ وہ زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر کندھے پر رکھا اور چل دیا۔ الہی بخش ایک جان دار پہاڑی جوان تھا لیکن صوفے کو اٹھا کر نیچے لے جانے میں اس کی سائس اکڑ گئی۔ جسم سے ہینڈ جیسے اہل پڑا تھا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ قاسم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ کام تو واقعی آدمی کو اندر سے چاٹ لیتا ہوگا۔

نیچے قاسم نے اسے صوفے کے ساتھ لڑکھڑاتے دیکھا تو صوفہ اتارنے میں اس کی مدد کی، اور بولا ”بیٹا، میں تجھے بوجھ اٹھانے کے لئے تو نہیں لایا ہوں۔ خردار جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا اب۔“

”لیکن چاچا، خالی رہنا مجھے برا لگ رہا ہے۔“ الہی بخش نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں، تو تو سہان ہے ہمارا۔“

”نہیں چاچا۔ کچھ نہیں کرنے سے اچھا ہے کہ میں چلا جاؤں۔“

قاسم کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا ”تو ٹھیک ہے۔ تو میرے ساتھ برتنوں والے ڈبے اترا دے۔ وہ نازک کام ہے۔ احتیاط سے کرنا ہوگا۔“

پورا سامان نیچے اتارنے میں دو گھنٹے لگے۔ پہلے صوفے کے بعد الہی بخش نے کسی بھاری چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھاری بوجھ بھی اٹھا سکتا ہے۔ لیکن بھاری سامان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا کسی اور ہی دنیا کا کام لگتا تھا۔

سامان کو ٹرک میں لدوانے میں قاسم کی مہارت سامنے آئی۔ جتنا سامان اس نے ٹرک میں لدوایا، الہی بخش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ممکن ہے۔ یہ سردار کا تجربہ تھا کہ کون سی چیز پہلے رکھی جائے اور کون سی چیز بعد میں۔ ٹرک میں موجود جگہ کو کیسے بہتر سے بہتر طور پر استعمال کیا جائے۔

وہ ٹرک میں بیٹھ کر ناظم آباد چلے۔ الہی بخش اس وقت بری طرح تھک چکا تھا۔ یعنی وہ بوجھ اٹھانے کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ مزدور تھکے ضرور تھے لیکن ٹرک میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو چھیڑتے ستاتے محکم ان کے چہرے سے دھلتی لگ رہی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو

وہ بھی مزدور نہ ہوتے شاید۔ کیونکہ اب انہیں زیادہ سخت مرحلہ درپیش تھا۔ انہیں سامان جو تھی منزل پر چڑھانا تھا۔ ٹرک کے سفر کے دوران الٹی بخش زرداد خان کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک اپنی ٹولی میں گھلا ملا نہیں تھا۔ الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ مگر عباس اس کام کو آسان کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ زرداد خان کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ زرداد خان کے چہرے پر اور آنکھوں میں صرف طمانیت تھی۔

الٹی بخش نے سرگوشی میں قاسم سے کہا ”واقعی چاہا“ یہ نیا لڑکا تو کمال کا نکلا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اتنا بوجھ اتنی آسانی سے اٹھا سکتا ہے۔“

”بیٹے، بوجھ اٹھانے کے لئے جان دار ہونا ضروری نہیں۔ ایک تو یہ پیدائشی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر آدمی جی دار بھی ہو تو زرداد خان جیسا ہی ہوتا ہے۔ مگر ایک بات بتاؤں۔“ قاسم کے لہجے میں تاسف ابھر آیا ”یہ لوگ زیادہ دن نہیں چلتے۔ میں نے بہت جلدی خون تھوکتے دیکھا ہے انہیں۔“

الٹی بخش لرز کر رہ گیا ”تب تو یہ ظلم ہے چاہا۔“

”ظلم نہیں۔ یہ زندگی ہے۔“ قاسم نے سادگی سے کہا ”یہ زرداد خوش نصیب ہے کہ ہماری ٹولی میں آگیا۔ میں نے لڑکوں کو اس کے سلسلے میں سمجھا دیا ہے۔“

وہ ایک عجیب اور بھرپور دن تھا۔ اس روز الٹی بخش نے جو دیکھا، سیکھا، سمجھا اور جانا، وہ عمر بھر اس کے ساتھ رہا۔ یہ بات اس پر واضح ہو گئی کہ طبقاتی تقسیم ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ کیسے خاندان، برادری اور نام و نسب کی اونچ نیچ ہے تو کیسے حیثیت کا تفاوت ہے۔ وہاں ایبٹ آباد میں وہ چکر تھا اور یہاں کراچی میں ایک صاب طبقہ تھا جو بڑے آراستہ گھروں میں رہتا تھا۔ روپیہ پیسہ اس طبقے کے لئے مسئلہ نہیں تھا۔ جبکہ دوسرا طبقہ دس روپے کمانے کے لئے ہر روز ایک ایسا بوجھ ڈھوتا، جس سے بوجھ ڈھونے والے جانور بھی گھبرا جائیں اور کچھ عرصے کے بعد وہ خون تھوکتا زندگی کی پھسلنی سے موت کی طرف پھسل جاتا۔

یہ سب سوچ کر الٹی بخش پر قہر قہری چڑھنے لگی۔ یہ زندگی ہے؟ اتنے لوگوں کے لئے اتنی مختلف!

زرداد خان وہی الماری اس بار بھی بغیر کے اوپر جو تھی منزل کے قلیٹ تک لے گیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس بلڈنگ کے زینے کشادہ تھے۔ اس سے کام آسان ہو گیا ورنہ طارق روڈ والی بلڈنگ میں زینے کے موڑ پر سامان اتارنے کے لئے ترکیبیں لڑائی پڑی تھیں۔

انہیں کام سے فارغ ہوتے ہوتے چھ بچ گئے۔ صاحب بہت خوش تھا۔ کسی چیز کو معمولی سی غراش بھی نہیں آئی تھی۔ کوئی برتن نہیں ٹوٹا تھا ”آپ سب چیک کر لیں صاب“ قاسم نے اس سے کہا۔

”چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت خوش ہوں تم

لوگوں سے۔“ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں بھی تمہیں خوش کر دوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد صاحب نے چائے، بسکٹوں اور سموں سے ان کی تواضع کی۔ پھر اس نے دس روپے کے آٹھ نوٹ قاسم کی طرف بڑھائے ”یہ ہے تم لوگوں کی مزدوری۔“ اس نے کہا۔ پھر اس نے سو کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا ”یہ ہے مجھے خوش کرنے کا انعام۔۔۔ تم آٹھوں کے لئے۔“

وہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے اسے سلام کر کے نیچے آ گئے۔ سب بہت خوش تھے۔ ان کے حساب سے انہیں ڈھائی دن کی دہاڑی ایک ہی دن میں مل گئی تھی۔ اچانک رجمو کو خیال آیا کہ کھانا نہیں کھایا گیا ہے اور بھوک لگ رہی ہے۔ عاقل نے بھی تائید کی۔

”نہیں بھئی، یہ کھانے کا تو وقت نہیں۔“ قاسم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”اس وقت کھا لو گے تو رات کو میرے گھر پر کیا کھاؤ گے۔“

بات معقول تھی ”استاد، کھانا کس وقت ملے گا؟“

”آٹھ بجے تیار ہو گا کھانا۔ میں کہہ کر آیا ہوں۔“ قاسم نے کہا ”چلو، کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ جسے زیادہ بھوک لگی ہو وہ کچھ بسکٹ سمو سے کھالے۔“

وہ سب ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ رجمو اور عاقل کے سوا کسی نے سمو سے نہیں کھائے۔ وہاں قاسم نے مزدوری کی رقم تقسیم کی۔ اس نے بائیس روپے الٹی بخش کی طرف بڑھائے تو وہ حیران رہ گیا ”یہ کیا چاہا؟“

”یہ تمہارا حصہ ہے۔“

”لیکن چاہا“ میں تو سمان ہوں۔ تمہارے ساتھ ایک دن گزارنے کے لئے آیا تھا۔“ الٹی بخش نے احتجاج کیا۔

”یہ تو تمہیں لینا پڑے گا۔ صاب نے آٹھوں آدمیوں کی مزدوری دی ہے۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔۔۔“

”بے کار بات مت کرو۔“ قاسم نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تمہارا حصہ لے کر ہم گناہ گار نہیں گئے کیا۔“

اس پر سب پیچھے پڑ گئے۔ الٹی بخش کو وہ پیسے لینے ہی پڑے۔ لیکن اسے بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔

ہوٹل سے باہر آ کے قاسم نے کہا ”یہ الٹی بخش اور زرداد میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ تم لوگ آٹھ بجے تک میرے گھر پہنچ جانا۔“

باقی سب لوگ چلے گئے۔ قاسم الٹی بخش اور زرداد کو لے کر بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ اس وقت صدر جانے والی بوس میں رش نہیں تھا۔ انہوں نے مزے سے بیٹھ کر سفر کیا۔ نمائش کے اسٹاپ پر وہ اٹھ گئے ”میں جیکب لائن میں رہتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ قریب پڑتا ہے میرا گھر۔“ قاسم نے وضاحت کی۔

سڑک پر کوئی پانچ منٹ چلنے کے بعد وہ کچے کچے مکانوں کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اب وہ تنگ گلیوں میں چل رہے تھے، جہاں دونوں طرف مکان ہی مکان تھے۔ زیادہ تر مکان ایسے تھے کہ ان میں مٹ کے پردے ہی دروازے کا کام کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک دروازے پر انہیں ٹھہرا کر قاسم مٹ کا پردہ ہٹا کے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے انہیں آواز دی ”آجاؤ“ وہ پردہ ہٹا کے اندر چلے گئے۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کے پار دو کمرے تھے۔ ایک کچا کمرہ تھا اور دوسرا پکا۔ کچے کمرے کی چھت ٹین کی چادروں کی تھی۔ سائڈ میں باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ صحن کے اس طرف والے حصے میں بیت الحلا تھا۔ درمیان میں ایک ٹھکی رکھی تھی۔

قاسم نے درمیان میں پڑا پردہ کھینچ کر گویا پردے کا اہتمام کر دیا۔ اس طرف تین چار چارپائیاں پڑی تھیں۔ تکیے بھی رکھے تھے۔ قاسم نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بیٹھ جاؤ اور ٹھکن ہو رہی ہے تو ہاتھ پاؤں پھیلا لو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

الٹی بخش اور زرداد بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر قاسم زرداد کو بوجھ اٹھانے کے رموز سمجھانے لگا۔ الٹی بخش توجہ سے سنتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا، کون جانے یہ باتیں کبھی کام آئی جائیں۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ لوگ تو اس وقت چونکے جب باہر سے کسی نے قاسم کو آواز دی ”استاد؟“

”ہو یہ لوگ بھی آگئے۔“ قاسم نے کہا۔ پھر دروازے کی طرف منہ کر کے پکارا ”آجاؤ یا رو۔“

مٹ کا پردہ اٹھا اور سب سے پہلے مشتاق اندر آیا۔ وہ کسی چیز کو کھینچ رہا تھا۔ دوسری طرف سے رجمو اسی چیز کو دھکیل رہا تھا۔ قاسم اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنی دیر میں وہ لوگ اندر آ گئے تھے۔

قاسم، الٹی بخش اور زرداد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ لوگ ایک ٹھیلہ لائے تھے۔ اور وہ بہت خوب صورت ٹھیلہ تھا۔ ٹھیلے کو دیکھ کر قاسم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ آگے بڑھا اور ٹھیلے کو چھو کر دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی غیر حقیقی چیز ہو۔

”کیا دیکھ رہے ہو استاد۔ یہ تمہارا ہی ہے۔“ ٹار نے کہا۔

”نئی زندگی مبارک ہو استاد۔“ رجمو بولا۔

قاسم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ٹھیلے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا ”میں تم لوگوں کی اس محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں۔“

”اس کی ضرورت نہیں استاد۔“ ٹار نے اس کی بات کاٹ دی۔ قاسم کے بعد وہ سب سے سینئر تھا ”بس اللہ تمہیں اس ٹھیلے سے بہت رزق دے۔ یہ دعا قبول ہو گئی تو سمجھو ہمیں محبت کا صلہ مل گیا۔“

دوسرے مزدوروں کی آنکھیں بھی چپکنے لگیں ”میں اتنی محبت کا حق دار تو نہیں تھا یا رو۔“ قاسم منمنایا۔

”تم تو اس سے زیادہ محبت کے قابل ہو استاد۔ پھر ہم سب غریب لوگ ہیں۔“ ٹار بولا۔

”بس اب یہ ڈراما ختم کرو اور کھانا کھلاؤ۔“ عباس نے ماحول کو بدلنے کی کوشش کی لیکن قاسم تو کسی اور ہی دنیا میں کھوا ہوا تھا۔ وہ ٹھیلے پر ہاتھ پھیر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں دیوار کے پار، دور، کہیں بہت دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے سر زدگی کی سی کیفیت میں ٹھیلے کو دھکیل کر آگے بڑھایا اور بے ساختہ آواز لگائی ”آلو، بھنڈی، بیٹکن، توری لے لو۔ سبزی والا۔“ اپنی آواز نے خود اسے بھی چونکا دیا۔ وہ خجالت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد معصوم مسکراہٹ تھی۔

”لاؤ استاد، ایک سیر آلو بیٹکن۔“ عباس نے شوخی سے کہا۔

”لیکن کچے ہوئے چائیں..... روٹی کے ساتھ۔“

قاسم کو احساس ہو گیا کہ ان لوگوں کو بہت بھوک لگ رہی ہوگی ”آج آلو گوشت ملے گا بیٹے۔“ اس نے شرمندگی سے کہا۔

”ارے تم لوگ بیٹھو نا۔“

وہ سب بیٹھ گئے۔ قاسم پردہ ہٹا کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ کی بنی ہوئی دو میزیں اٹھا لایا۔ وہ اس نے چارپائیوں کے درمیان رکھ دیں ”تم لوگ ہاتھ دھولو۔ میں کھانا لارہا ہوں۔“

کھانے میں آلو گوشت تھا اور پنے کی بریانی تھی۔ وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ الٹی بخش کو پردے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ٹھیلے کو دیکھ رہی تھیں اور آوازوں سے ان کی خوشی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ الٹی بخش کو اس لمحے ان مزدوروں پر ٹوٹ کر پیا آ گیا۔ انہوں نے اس گھرانے کو کتنی بڑی خوشی دی تھی۔ برتن تسمیٹنے کے لئے قاسم کا وہ بیٹا آیا، جس کا اس نے الٹی بخش سے تذکرہ کیا تھا۔ دیکھنے میں وہ دس سال کا بھی نہیں لگتا تھا۔ کھانے کے بعد گپ شپ ہوتی رہی۔ اس دوران ان لوگوں نے چائے پی۔ پھر قاسم نے ان سے پوچھا ”اب کیا ارادہ ہے؟“

”یہ تو ہمیں تم سے پوچھنا ہے استاد۔“ ٹار نے کہا ”یہ تو معلوم ہو گیا کہ تم سبزی فروٹ کا کام کرو گے۔“

”ہاں۔ تو اب پوچھنا کیا ہے؟“

”صبح منڈی جاؤ گے؟“

”ہاں“ قاسم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کس وقت جاؤ گے؟“

”صبح چار بجے جانا ہو گا۔“

”تو پھر استاد ہم بھی یہاں سے نکلنے والے تو نہیں۔“ ٹار نے کہا۔ اس پر قاسم نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر دوسروں کو جن کے سر تانید میں مل رہے تھے ”ہم تمہارے ساتھ منڈی چلیں گے۔“ ٹار نے مزید کہا ”ہمارا رکنا مسئلہ ہو تو اور بات ہے۔ ہم چلے

بائیں گے اور صبح چار بجے آجائیں گے۔“
 ”یہی کوئی بات نہیں۔ بس تم لوگوں کو تکلیف ہوگی۔“ قاسم نے شرمندگی سے کہا ”اور پھر اس کی ضرورت کیا ہے۔“
 ”ضرورت تو ہے۔“ مشتاق بولا۔

”اور ہم لوگوں کی تکلیف کی فکر مت کرو۔“ رحیمو نے کہا۔
 ”تم فوراً جگا کریں گے۔ چار بجے تک تاش کی پارٹی جیسے گی۔“
 ”تم تم لوگوں کو صبح کام پر۔۔۔۔۔“

”فج اتوار ہے استاد۔“ ثار بولا ”یہ بتاؤ تاش کی دو گڈیاں ہیں تمہارے پاس؟“

”ہاں ہیں تو۔ لیکن یا رو منڈی چلنے کی ضرورت نہیں۔“
 ”تم اس بات کو چھوڑو استاد۔ تاش لے آؤ۔“ رحیمو نے بلبلے کن لہجے میں کہا۔

قاسم اندر گیا اور تاش کی دو گڈیاں لے آیا۔ وہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہوئے اور تپ چال کھیلنے لگے۔ الٹی بخش قاسم، ثار اور رحیمو کے ساتھ تھا۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اندر بچے تو اید سو گئے تھے لیکن قاسم کی بیوی نہیں سوئی تھی۔ اس کی بدولت ن لوگوں کو چائے ملتی رہی۔

پھر اچانک عاقل کو خیال آیا ”اب بس کریں استاد۔ میرا خیال ہے وقت ہو گیا ہے۔“

قاسم اور ثار نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں ابھی رات کا اندھیرا تھا ”ہاں وقت ہو گیا ہے۔“ ثار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
 ”تم لوگ ہاتھ منہ دھولو۔ پھر چلتے ہیں۔“ قاسم نے کہا۔

پندرہ منٹ بعد وہ سب باہر نکل آئے۔ باہر لگتا تھا پوری کائنات سو رہی ہے۔ وہ سنسان سڑک پر بے فکری سے دندناتے ہوئے چلتے رہے۔ الٹی بخش ثار کے ساتھ قدم ملا کر چلتے لگا۔ قاسم سب سے آگے تھا۔ اس کے ساتھ زرد ادھل رہا تھا۔

”ثار بھائی!“ اچانک الٹی بخش نے سرگوشی کی ”اب تم لوگ قاسم چاچا کو سبزی فروٹ دلاؤ گے نا؟“

ثار نے سر گھما کر اسے دیکھا ”ہاں بخشے“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

الٹی بخش نے جیب سے تیس روپے نکال کر ہاتھ میں رکھ لئے تھے۔ وہ اس نے ثار کی طرف بڑھائے ”میں بھی تمہارے ساتھ نال ہونا چاہتا ہوں ثار بھائی۔“

ثار نے اس کے ہاتھ کو دیکھا لیکن پیسے لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا ”اس کی ضرورت نہیں بخشے۔ ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ پیسے ہیں۔ ہم سب بہت عرصے سے اس موقع کے لئے رقم بچا رہے تھے۔“

”یہ بات نہیں ثار بھائی۔ میں تمہارے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں۔ قاسم چاچا سے میرا بھی تعلق ہے۔“

”نہیں بخشے ضرورت ہوتی تو میں ضرور لے لیتا۔“

”تم میرا دل توڑ رہے ہو۔ صرف اس لئے کہ میں تم میں سے نہیں ہوں۔“ الٹی بخش نے دل گرفتگی سے کہا۔
 ”یہ بات نہیں بخشے۔“ ثار نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔
 ”پر تو بھی تو مزدور ہے اور مزدور کا ہاتھ عام طور پر تنگ ہی رہتا ہے۔“

”یہ تو وہی پیسے ہیں جو مجھے صرف تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے ملے ہیں۔ ان پر تو میرا حق بھی نہیں تھا۔ تم لوگوں نے زبردستی مجھے دے دیے۔ اب تم انہیں قبول نہ کر کے مجھے احساس دلا رہے ہو کہ میں بد رنگ ہوں۔“

”تو پاگل ہو گیا ہے۔ دیکھ بھائی، تو بھی مزدور ہے اور ہم بھی۔ یہ بڑا رشتہ ہوتا ہے۔ ہمارے دکھ سکھ ایک سے ہیں۔ مگر میری جان، یہ معاملہ برادری کا۔۔۔۔۔“ ثار کہتے کہتے رکا ”۔۔۔۔۔ برادری کا بھی نہیں، ٹولی کا معاملہ ہے یہ۔“

”ٹھیک ہے ثار بھائی۔“ الٹی بخش نے اداس لہجے میں کہا۔
 ”آئندہ میں اپنی حد میں رہوں گا۔“

ثار چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا ”لا پیسے مجھے دے اور اب منہ مت لٹکا۔“ اس نے الٹی بخش سے نوٹ لے کر گئے۔ وہ تیس روپے تھے۔ ثار جانتا تھا کہ گزشتہ روز کی مزدوری میں حصہ بائیس روپے بنا تھا یعنی اس میں آٹھ روپے الٹی بخش نے اپنی جیب سے ملائے تھے جبکہ پچھلے روز اس نے کام بھی نہیں کیا۔ پورا دن بلکہ اب تک انہی لوگوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔

ثار کا دل دکھنے لگا۔ لیکن اب وہ الٹی بخش سے حجت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے خاموشی سے پیسے جیب میں رکھ لئے۔
 وہ سب سبزی منڈی کی طرف چلتے رہے۔

منڈی دیکھ کر الٹی بخش حیران رہ گیا۔ وہاں ایسی گھاگھی، ایسا جھوم تھا، جیسے دن نکل چکا ہو۔ قاسم اپنے تھوڑے تھوڑے کر کے بچائے ہوئے پیسے لایا تھا اور اسی حساب سے مال خریدنا چاہتا تھا۔ ثار نے جو اسے پھلوں کی کئی پیٹیاں سبزی کے علاوہ دلائیں تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں ”اس سب کی ضرورت نہیں تھی یا رو۔ وہ ٹھیلایا ہی بہت تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔
 ”بے کار باتیں مت کرو استاد۔“ رحیمو بولا۔

واپسی کے سفر میں وہ سب لدے پھندے تھے۔ اور بہت خوش تھے۔ جیسے وہ سب ہی کوئی نیا کام شروع کر رہے ہوں۔ گھر پہنچ کر انہوں نے ٹھیلہ لدوانے میں قاسم کی مدد کی۔ سب بہت خوش تھے۔ ہر شخص بساط بھر مشورے دے رہا تھا۔ سبزیاں اور پھل لگ گئے تو ٹھیلہ اور خوب صورت لگنے لگا۔

اس دوران سورج نکل آیا تھا۔ قاسم نے انہیں ناشتا کرایا۔ سب نے ڈٹ کر چائے میں پاپے بھگو کر کھائے۔ پھر چلنے کا وقت آگیا۔ قاسم کو ٹھیلہ لے کر لٹکنا تھا۔ اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا۔

”استاد، ہمیں اجازت دو۔“ ثار نے کہا ”ہم اب چلتے ہیں تم

بھی بسم اللہ کرو۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“

قاسم ممنونیت بھری بھگی آنکھوں سے ایک ایک کو ٹکرا رہا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اسے احساس تھا کہ شکر یہ بہت چھوٹا لفظ ہے۔

مہاس نے بھرے ہوئے ٹھیلے کو ہلکے سے دھکیلا ”واہ استاد یہ تو پھول ہو رہا ہے۔ تمہارے تو مزے آگئے۔“ اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

○☆○

وہ دن اور وہ رات الہی بخش کبھی نہیں بھولا، جو اس نے مزدوروں کے ساتھ گزارا تھا۔ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے ایک دوسرے کے لئے ان کی محبت دیکھی تھی۔

بس اس بات پر وہ جھنجھلائے لگتا۔ کیا مصیبت ہے جس چیز سے بھاگ کر وہ کراچی آیا ہے وہ یہاں بھی موجود ہے۔ اسے یاد آیا، ایک بار اس کے باپ نے کہا تھا، محبت تو سبھی کرتے ہیں بیٹے۔ اور جو لوگ خود سے نہیں کرتے، انہیں محبت کرنی پڑ جاتی ہے۔ اچھا یہی ہے کہ آدمی محبت کی عادت ڈال لے۔ اس سے اللہ بھی خوش رہتا ہے اور اپنا آپ بھی۔ جو آدمی محبت کرنا نہیں چاہتا وہ بہت نقصان میں رہتا ہے۔ جب وہ محبت پر مجبور ہوتا ہے تو بہت بے بس ہوتا ہے۔ بہت تکلیفیں اٹھاتا ہے وہ۔

مزدوروں نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شاید وہ محبت ان کی ضرورت تھی۔ ان کا روزگار، ان کے مفادات، ان کے دکھ سکھ جو مشترک تھے۔ پھر بھی وہ تھی تو محبت ہی۔ ورنہ انہیں قاسم کے لئے اتنا کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وقت نکل گیا تھا۔ قاسم اب ان کے لئے بے کار تھا۔ انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ پھر انہوں نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔ محبت! ہاں وہ محبت ہی تھی۔ الہی بخش کو اعتراف کرنا پڑا۔

اب اسے اپنا تجربہ بھی کرنا تھا۔

قاسم کے بڑی فروٹ کے لئے پیسے تو اس نے بھی ملائے تھے۔ تو کیا یہ محبت تھی؟ ہرگز نہیں۔ انیت؟ یہ بھی نہیں۔ تو پھر کیوں؟ بہت غور کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اس کی خودداری، اس کی انا کا معاملہ تھا۔ اسے مزدوری کئے بغیر اجرت دی گئی تھی جو اصرار کی وجہ سے اسے لینی پڑی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ کسی بھی بوائے سے اس میں مزید اپنی رقم ملا کر انہیں لوٹا دے۔ اور بہانہ موجود تھا۔

الہی بخش کو مایوسی ہوئی۔ کیا وہ محبت کی اہلیت ہی نہیں رکھتا؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کبھی اس نے کسی سے محبت کی ہو۔ لیکن نہیں۔ اسے تو شاید ماں باپ سے بھی محبت نہیں۔ کراچی آنے کے بعد اس نے ابا کو صرف ایک خط لکھا تھا۔ اور گھر کے

لوگ اسے کبھی یاد بھی نہیں آتے تھے۔ وہ یہاں بہت خوش تھا۔

اس دن کے بعد سے محبت الہی بخش کے سر پر سوار ہو گئی۔ صبح سویرے اپنے ٹھکانے پر آکر بیٹھتا تو گرد و پیش کی دیرانی اور اپنی تنہائی میں وہ محبت اور عشق کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اسے باپ کی باتیں یاد آتیں۔ گرد و پیش میں زندگی بیدار ہوتی تو وہ چوٹ لگتا اور اس پر جھنجھلا تا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کے بارے میں کیوں سوچتا رہتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ محبت ہی کر لے۔

درحقیقت وہ خوف زدہ تھا۔ باپ کی بات کے حوالے سے اسے خوف آتا تھا۔ کیا محبت نہ کرنے کی سزا میں اسے ایسی محبت ہوگی کہ جو اسے مجبور اور بے بس کر کے رکھ دے گی۔ وہ یہ سوچتا اور لرز جاتا۔ وہ عشق اور محبت سے گھبرا کر ہی تو گھر چھوڑ کر بھاگا تھا۔

لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے پردیس میں محبت ہوگی، جس کے سامنے وہ بے بس ہو جائے گا۔ اور یہ محبت کے خلاف مزاحمت کا رد عمل ہوگا۔

وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اب وہ وقت آپہنچا ہے!

○☆○

الہی بخش کو پہلی نظر میں عشق ہوا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کا خیر ہی عشق کی مٹی سے اٹھا تھا۔ لیکن یہ عشق کہاں، کس جگہ، کس انداز میں ہو اس پر ضرور حیرت کی جاسکتی ہے۔

الہی بخش کو ایک بڑا کام ملا تھا جو اس نے چار دن میں نمٹایا تھا۔ اجرت کے علاوہ انعام بھی ملا تھا۔ لہذا جیب بھاری تھی۔ وہ بے فکر کی طرح مست بیٹھا تھا۔ صبح سے کام نہیں ملا تو اس کی اسے پروا بھی نہیں تھی۔ اس روز وہ کام کرنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کام مل جاتا تو وہ انکار بھی نہ کرتا۔ یہ مزدوری کے اصول کی بات ہے ورنہ دل تو اس کا یہی چاہا تھا کہ اس روز گھر بیٹھ کر آرام کرے، چار دن کی تھکن اتارے۔ لیکن اپنے کام میں نوکری سے زیادہ پابندی کرنا پڑتی ہے۔ الہی بخش جانتا تھا کہ یہ آزادی کی قیمت ہے اس لئے وہ معمول کے مطابق اپنا محنت کا شوکیس لگائے بیٹھا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ طارق روڈ کی رونق اپنے شباب پر تھی۔ الہی بخش کو یہ وقت بہت اچھا لگتا تھا۔ عام طور پر وہ اسی رونق کی خاطر دیر تک رکا رہتا تھا۔ کسی دن تھکن بہت زیادہ مجبور کرتی تو شام کو جلدی گھر چلا جاتا ورنہ رات کا کھانا کھا کر ہی جاتا۔

وہ اپنے معمول کے مطابق نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ نظریں وہ کم ہی اٹھاتا تھا۔ اچانک اسی جگہ جہاں اس کی نظریں جمی تھیں، ایک شاہنگ بیک گرا اور اس طرح گرا کہ اس کی تمام چیزیں بکھر گئیں۔ کچھ کپڑے تھے، کچھ بال پن اور کچھ ایسی چیزیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ساتھ ہی ایک ٹرپلی آواز سنائی دی۔ ”او مال گاڑ۔“

الہی بخش نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور دیکھتے کار کھتا رہ گیا۔ وہ

جس لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ ہوئی۔ اس
 بچہ کو کھان کی طرح دیکھا ہوا تھا۔ آنکھیں کونڈوں سی تھیں۔
 اس نے اپنے تھے جیسے بڑی نزاکت اور نفاست سے تراشے گئے
 ہوائی ہونٹ کے اوپر پسینے کے قطرے یوں چمک رہے تھے
 صبح کے وقت گلاب پر پھنسنے اور جسم جیسے سانچے میں تیار کیا
 تھا۔ لڑکی کے ہونٹ یوں کھلے ہوئے تھے جیسے وہ ابھی تک پکار
 رہی ہو۔ اومائی گاڑ۔

الٹی بخش اسے ٹھنکی باندھے دیکھا رہا۔ اسے اس لڑکی کے سوا
 کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ رنگ کے
 بے اور برش لگائے ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا ہے۔ وہ زمان و مکاں
 ماورا ہو گیا تھا۔

”اب دیکھ کیا رہی ہو۔ اٹھاؤ نا۔“

اس آواز نے الٹی بخش کو چونکا دیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا
 لڑکی کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ وہ ایک معمر خاتون تھیں۔ ان
 چہرے پر اور آنکھوں میں برہمی تھی۔ الٹی بخش کو احساس ہو گیا
 وہ جس طرح لڑکی کو دیکھ رہا تھا وہ لڑکی کی ماں نے دیکھ لیا ہے اور
 رہے کہ اسے یہ بات اچھی نہیں لگی ہے۔

الٹی بخش نے نظریں جھکا لیں۔ اب اس کے سامنے لڑکی کی
 ہوتی ہوئی چیزیں تھیں۔ وہ شرمسار تھا کہ اس نے ایسی معیوب
 ت کی۔

”بھی سمیٹتی ہوں می۔“ اس نے لڑکی کی سُری آواز سنی۔
 اگلے ہی لمحے لڑکی جھپٹتے ہوئے خود اس کی نظروں کے فوکس
 آئی اور یوں آئی کہ اس کے دل کی دنیا زیر ہو گئی۔ لڑکی کا
 ڈھلک گیا تھا۔ جیسے دیکھتے ہوئے نظروں کی کوئی کتاب کھل گئی
 وہ نظارہ الٹی بخش کے لئے بالکل نیا تھا۔ وہ اسے اچھا بھی نہیں
 لیکن دل چاہا کہ دیکھتا ہی رہے۔ اسے اپنے کانوں کی لویں
 راہ ہوتی اور چہرہ تھمتاتا محسوس ہوا۔ تپش سے گھبرا کر اس نے
 اس اٹھائیں تو سامنے لڑکی کی ماں کی شربار نگاہیں تھیں۔ وہ گھبرا
 سامنے دیکھنے لگا۔ اس لمحے اسے اپنا آپ بہت چھوٹا بہت حقیر
 س ہو رہا تھا۔

جانے کب تک وہ یونہی سامنے دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہتا تھا
 زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ نظریں نہیں تو اسے
 کہ وہ دونوں جانے کب کی جاچکی ہیں۔ اس نے اطمینان کی
 لی اور نظریں جھکا دیں۔

لیکن اس کا اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اس کی جھکی ہوئی
 کے سامنے لڑکی کا چہرہ ابھر آیا۔ اور وہ جیسے تصور نہیں جیتا
 سانس لیتا چہرہ تھا کہ وہ ہاتھ بڑھائے اور چھو لے۔ اس نے
 ٹٹا تو لڑکی کی ماں کی شربار نگاہیں سامنے آ گئیں۔ اس نے گھبرا
 گھمایا تو وہ نظارہ سامنے آ گیا جس کی تپش وہ اب تک محسوس
 ہاتا تھا۔ اس نے اسے جھپٹنے کے لئے پلکیں جھپکیں تو لڑکی کا چہرہ
 مائے تھا۔

اب تو ان تینوں جھکیوں کی آنکھ پھولی شروع ہو گئی۔ پھر ان
 میں سے شربار نگاہوں والی جھلک جیسے کسی خود کار طریقے سے
 خارج ہو گئی۔ اور کچھ دیر بعد صرف لڑکی کا چہرہ گیا جو نظروں کے
 سامنے سے ہٹنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ایک راہ گیر سے وقت
 پوچھا۔ سن کر اسے یقین ہی نہیں آیا کہ سوا آٹھ بج چکے ہیں۔ لیکن
 یہ سچ تھا کہ رات ہو چکی تھی۔ الٹی بخش کو حیرت اس پر بھی تھی کہ
 اسے اب تک بھوک نہیں لگی۔ عام طور پر وہ آٹھ بجے کھانے سے
 فارغ ہو جاتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ہی ناقابل یقین تھی کہ اس
 نے اتنا وقت یونہی بیٹھے بیٹھے صرف وہ چہرہ دیکھتے گزار دیا ہے۔ ایسا
 تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے تصور میں تو کبھی ابا اور اماں کے
 چہرے بھی نہیں آئے تھے۔

بہر حال وہ اٹھ گیا۔ یہ بات ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی
 تھی کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔

بھوک نہیں تھی۔ پھر بھی وہ ہوٹل میں چلا گیا۔ بھوک ہونہ
 ہو، کھانا کھانا ضروری ہے۔ آدھی رات کو گھر میں بھوک لگی تو بڑا
 مسئلہ بن جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ کھانا زہر بار کرنے کی کوشش کرتا
 رہا۔ لیکن چند لمحوں سے زیادہ اس سے کھایا نہیں گیا۔ یہ بھی
 غیر معمولی بات تھی ورنہ بھوک اسے ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی۔ اور
 وہ کھانا بھی طبیعت سے کھاتا تھا۔ پھر یہ بے رغبتی کیوں۔ جبکہ اس
 کی کوئی ظاہری وجہ بھی نہیں تھی۔ پورا دن اس نے معمول کے
 مطابق گزارا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہمیشہ کی طرح ساڑھے پانچ بجے کھایا
 تھا۔ ہر روز اسے شام سات بجے سے بھوک لگنے لگتی تھی اور آٹھ
 بجے وہ رات کا کھانا کھالیتا تھا۔

اسی الجھن میں وہ گھر پہنچ گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی
 زندگی میں کوئی بن بلایا انقلاب آچکا ہے۔ گھر میں رہنے والے
 ساتھیوں سے بھی اس نے اس روز کوئی کپ شپ نہیں کی۔ ان
 کے ساتھ تاش کھیلنے بھی نہیں بیٹھا۔ بمانہ اس نے یہ کیا کہ حشک
 کی وجہ سے نیند جلدی آرہی ہے لیکن درحقیقت اس کی آنکھوں
 میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہاں تو بس ایک ضدی چہرہ جم کر
 بیٹھ گیا تھا۔

وہ آنکھیں بند کئے لیٹا اس چہرے کو تکتا رہا۔

اسے نیند بھی ہمیشہ بہت اچھی آتی تھی۔ گہری اور پرسکون
 نیند۔ ابابج بھی اسے جگانے کی کوشش کرتے تو جھنجھلا جاتے ”یہ
 لڑکا کیسا بے خبر سوتا ہے۔“ وہ اماں سے کہتے ”کوئی آکر اسے کاٹ
 بھی ڈالے تو اسے پتا نہیں چلے گا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو۔“ اماں خفا ہو کر کہتیں ”سوچ سمجھ کر
 منہ سے لفظ نکالا کرو۔“

”تو یہ اٹھتا کیوں نہیں۔“

”بچپن ہی سے مدھوش سوتا ہے یہ تو۔“ اماں کہتیں ”اور یہ تو
 ایسا وقت پر سونے اور اٹھنے والا ہے کہ کانٹوں پر لیٹ کر بھی

”سو جائے۔“

اور اب وہ مدہوش سونے والا اپنے وقت پر کانٹوں پر بھی سو جانے والا الہی بخش وقت گزر جانے کے بعد بھی جاگ رہا تھا۔ تاش کی محفل کب کی اٹھ چکی تھی۔ سب لوگ کب کے سو چکے تھے۔ رات کا مخصوص سکوت طاری تھا۔ اور وہ کروٹیں بدلے جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ چہرہ سامنے آجاتا۔ آنکھیں کھولتا تو بے چینی ہونے لگتی۔ وہ جھنجھلاتا۔ اپنے بال نوچنے کو سر پینے کو جی چاہتا۔ بس آنکھیں بند کرنے سے سکون ملتا تھا۔ اور آنکھیں بند کرتے ہی وہی چہرہ وقت بہت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات کی سانسیں اکٹرتی گئیں۔ وہ محفل ہوتی گئی لیکن الہی بخش کو نیند نہیں آئی۔ وہ آنکھیں کھولتا تو جلتا، کڑھتا اور جھنجھلاتا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ چہرہ اسے پر سکون کردیتا مگر پھر بے بسی کا احساس ستانے لگتا۔ اپنی خوشی سے جاگنے کی اور بات ہے لیکن یوں وہ کبھی نہیں جاگا تھا۔

”یہ کیسی بے بسی ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔

اسی لمحے فجر کی اذان شروع ہو گئی۔ یہ اس کے معمول کے مطابق اٹھنے کا وقت تھا۔ لیکن وہ اٹھا نہیں ”یہ کیسی بے بسی ہے؟“ اس نے دہرایا۔

”اللہ بہت بڑا ہے.....“ مؤذن پکار رہا تھا۔

”یہ کیسی بے بسی ہے؟“ الہی بخش بڑبڑا رہا تھا۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔“

”میں سو کیوں نہیں سکتا؟ یہ کیسی بے بسی ہے؟“

”آؤ نماز کی طرف۔ آؤ بھلائی کی طرف.....“

”یہ سب کیا ہے؟ میں اتنا بے بس کیوں ہو گیا ہوں؟“

”نماز نیند سے بہتر ہے۔“

”یہ کیسی بے بسی ہے؟“

مؤذن نے آخری بار اللہ کی کبریائی کا اور اس کے سوا کسی معبود کے نہ ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسا سکوت طاری ہو گیا جیسے پوری کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ چند لمحوں کے اس سکوت نے الہی بخش کو اس کے سوال کا جواب دے دیا۔ اس کے کانوں میں اب کی آواز گونجی جو لوگ خود سے محبت نہیں کرتے انہیں محبت کئی پڑ جاتی ہے۔ جو آدمی محبت کرنا نہیں چاہتا وہ بہت نقصان میں رہتا ہے۔ جب وہ محبت پر مجبور ہوتا ہے تو بہت بے بس ہوتا ہے۔ بہت دکھ اٹھاتا ہے وہ۔

”تو یہ بے بسی اسی لئے ہے، الہی بخش نے خود سے کہا۔ اس لمحے اسے پوری طرح ادراک ہو گیا کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ محبت پہلی نظر میں اور ایک ایسی لڑکی سے جس کا وہ کسی طور ہمسر نہیں ہے۔ وہ دولت مند گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ جبکہ وہ ایک دھمائی مزدور تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اسے باپ کی بات نہ ماننے کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی سزا محبت ہی کی شکل میں

دی گئی ہے۔ اب وہ بے بس اور مجبور رہے گا۔ نہ اپنی مرضی سے کھاسکے گا نہ اپنی مرضی سے سو سکے گا۔

اچانک ہی اسے طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے سوچا، یہ تو بس چند روز کی سزا ہے۔ اب وہ لڑکی کہاں مل سکے گی۔ وہ تو شاید زندگی میں کبھی نظر بھی نہ آئے۔ چند روز بعد وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ بلکہ ممکن ہے آج ہی.....! لیکن کوئی نامعلوم حس اسے بتا رہی تھی کہ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیت الخلا سے آنے کے بعد ٹشکی کے سامنے ہاتھ دھوئے بیٹھا تو اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ وضو کر رہا ہے۔ احساس ہوا تو پہلے اسے حیرت ہوئی اور پھر ہچکچتا دوا سر میں ڈنک گڑونے لگا۔ وہ تو ہمیشہ اسی وقت جاگتا رہا ہے پھر کیوں اسے نماز کا خیال نہیں آیا۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔ محبت اسے نماز کی طرف لے جا رہی تھی۔

○☆☆○

دن ست روی سے گزرتے رہے۔ الہی بخش ہر روز اپنی امید کو آنے والی کل کے سپرد کردیتا۔ اس کی دلیل مقول تھی۔ جسے اب کبھی ملنا نہیں تھا، دل کب تک اس کی محبت میں گرفتار رہ سکتا ہے۔ کب تک آنکھیں اس ایک جھلک کے عکس کو بچا سکیں گی۔ مگر معاملہ برعکس تھا۔ محبت کی دیوانگی ہر روز فزوں تر ہوئی جا رہی تھی۔ عکس آنکھوں میں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دو مہینے اسی طرح گزر گئے تو الہی بخش نے شکست تسلیم کر لی۔ اس نے مان لیا کہ بات اگرچہ آگے بڑھنے والی نہیں لیکن یہ روگ عمر بھر کا معلوم ہوتا ہے۔

اسے احساس تھا کہ وہ خود بدل گیا ہے۔ اس کے معمولات بدل گئے ہیں۔ سب کچھ بے ترتیب ہو گیا تھا۔ بھوک لگتی تو وہ کھانا کھا لیتا۔ نہ لگتی تو نہ کھاتا۔ نیند آتی تھی مگر پہلے کی طرح نہیں۔ اب وہ بے سدھ ہو کر نہیں سوتا تھا۔ وہ خوش مزاج بھی نہیں رہا تھا۔ بہت کم آمیز ہو گیا تھا وہ۔ کسی سے بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ گھر کے ساتھ ہی اس سے شاکی رہنے لگے تھے۔ مزدوروں کی ٹولی نے بھی اس میں تبدیلی محسوس کر لی تھی۔

اس لڑکی کی دید کو دو ماہ ہوئے تو الہی بخش نے شکست تسلیم کر لی۔ مزید ایک ماہ گزرا تو اس میں اور تبدیلی آئی۔ تسلیم کے بعد سپردگی کا مرحلہ آیا۔ اس نے خود کو اس محبت کے سپرد کر دیا جو خود اسے ناقابل یقین حماقت لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تنگ مزاجی رخصت ہو گئی۔ وہ آدم ہزار نہیں رہا۔ مزاج میں بلا کی نرمی اور عیسیٰ آہنی۔ اس کا لہجہ نرم اور آواز شیریں ہو گئی۔ اس کی متحمل مزاجی بھی بڑھ گئی تھی۔ کم گو اور کم آمیز وہ اب بھی تھا مگر کوئی مخاطب ہوتا تو وہ بڑی توجہ سے بات سنتا اور بے حد رمان سے جواب دیتا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھ گئی تھی۔ اس نے آٹھ لاکھ بات کرنا اب آسان نہیں رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ عموماً

نظرں اٹھا کر بات ہی نہیں کرتا تھا۔

سب سے زیادہ مزدوروں کی ٹولی اس کی تہیلیوں پر حیران تھی۔ وہی اسے سب سے قریب سے دیکھ بھی رہے تھے۔

نظرں جھکا کے بازار کی رونق سے لطف اندوز ہونے والا الٹی بخش اب نظرں اٹھا کر اس رونق کو دیکھتا بلکہ ٹٹوتا تھا۔ وہ دور، نزدیک ہر چہرے کو غور سے دیکھتا جیسے اسے کسی خاص چہرے کی، کسی خاص شخص کی تلاش ہو۔ اگر اس کی نگاہوں میں مصیبت نہ ہوتی تو وہ یہی سمجھتے کہ طارق روز نے اسے خراب کر دیا ہے۔ پہلے تو وہ عورتوں کو نظر اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ دل میں گدگدی کرتے ہوئے گزرنے والی خوشبو اور چھو کر گزرنے والی لباس کی سرسراہٹوں کے سامنے مدافعت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اب وہ عورتوں، لڑکیوں کو خاص طور پر دیکھتا۔ مگر اس کی نظروں میں مصیبت اور ایک بے نام سے تجسس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کام میں اس کی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ کام آتا تو وہ زیادہ مزدوری طلب کرتا۔ اس کے انداز سے لگتا کہ وہ کام سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے وہ اٹھ کر ادھر ادھر گھومتا اور باتیں کرتا تھا مگر اب وہ بس اپنی جگہ بیٹھا خریداری کے لئے آنے والوں کو ٹٹکارتا رہتا۔

مزدور بہت تجسس تھے۔ ٹار نے تو کہہ دیا تھا کہ یہ ساری علامات عشق کی ہیں۔ ضرور اپنے محلے میں اسے کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ دوسروں کے دل کو بھی یہ بات لگتی تھی۔ مگر ایک بار الٹی بخش کے ساتھ رہنے والا کرامت اس سے ملنے آیا تو مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا۔

ٹار نے کرامت سے بھی یہی بات کہی۔

”نہیں جی، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ کرامت نے شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”وہاں تو یہ صرف سونے کے لئے جاتا ہے۔ رات نو بجے کے قریب گھر پہنچتا ہے اور فوراً ہی سونے کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ صبح سات بجے یہاں آنے کے لئے گھر سے نکل پڑتا ہے۔ اس نے تو کبھی کسی پڑوسی کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ کسی پڑوسن سے عشق کیا کرے گا۔“

ٹار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ تو اسی ایک امکان پر تکیہ کئے بیٹھا تھا۔ وہ اس طرح رد ہوا تو اس کی عقل ہی جواب دے گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے سنبھل کر کہا ”تو پھر؟“

”ہم لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں پر کوئی چکر چلا ہے۔“ کرامت نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”یہاں؟“ ٹار نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا ”یہ تو پیارے بمائی جادو مگرمی ہے۔ یہاں کوئی عشق نہیں کر سکتا۔ یہ تو ریتلا میدان ہے، جہاں پھول نہیں کھل سکتے۔ پھول آتے ہیں، جادو سے یہ بارش بن جاتا ہے۔ پھول پلے جاتے ہیں تو پھر میدان اور ریت۔ یہاں عشق کیسے ہو سکتا ہے۔“

”تم لوگ کام پر کس وقت آتے ہو؟“ کرامت نے پوچھا۔

”ساڑھے نو بجے۔ زیادہ جلدی آگئے تو نو بجے۔“

”لیکن یہ بخشا سات بجے گھر سے نکلتا ہے۔ ساڑھے سات بجے یہاں آ جاتا ہوگا۔“

”اس وقت تو یہاں آلو بول رہے ہوتے ہیں۔“ مشتاق بولا۔

”تو یہ بخشا یہاں اتنی دیر کیا کرتا ہے؟“ کرامت نے سوال اٹھایا ”میرا تو خیال ہے، ایسے ہی وقت میں یہاں کوئی چکر چلا لیا ہے اس نے۔“

”مگر یہاں تو کوئی ہوتا ہی نہیں۔“ رحیمو نے کہا۔

”ارے یہاں فلیٹ بھی تو ہیں۔“ کرامت نے آنکھ مارے ہوئے کہا۔

”لیکن پورے دن تو اسے کسی فلیٹ کی طرف متوجہ ہوتے نہیں دیکھا۔“ عباس بولا ”ایسی کوئی بات ہوتی تو نظریں ضرور آتی۔“

”یہ بخشو ہے بہت گہرا آدمی۔ راز چھپانا اسے آتا ہے۔“ ٹار نے گہری سانس لے کر کہا ”غیر میں خود دیکھوں گا کسی دن۔“

محفل برخاست ہو گئی۔ کرامت پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔



الٹی بخش کو اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس کے بارے میں کتنے تجسس ہو رہے ہیں۔ اسے پتا کیا چلتا۔ وہ تو سرشاری کی عجیب سی کیفیت میں تھا۔ اسے دوسروں کو دیکھنے اور سمجھنے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ یہ کیا کم تھا کہ اس نے ایک بہت اہم بات سمجھ لی ہے۔ وہ یہ کہ اسے پہلی نظر میں عشق ہو گیا ہے۔

اب تو اس کے دل میں ابا کی بات کا خوف بھی نہیں تھا۔ یہ خیال ہی دل سے نکل گیا تھا کہ یہ محبت سزا ہے۔ وہ سوچتا، اگر یہ سزا ہے تو اتنی سخت سزا بھی نہیں۔ اس میں تو عجیب مستی، بے خودی ہے۔ اپنا آپ اچھا لگنے لگا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایک لمحے کے لئے ایک خلش ستائی، کاش وہ اس لڑکی کو پھر دیکھ سکے۔ اس کے متعلق جان سکے۔ وہ کون ہے، کیسی ہے، کیا نام ہے اس کا؟ اس کی پسند، ناپسند۔ مگر وہ فوراً ہی اس غلش کو جھٹک دیتا۔ اس نے خود سے بہت طویل بحث کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنا، اس کے بارے میں جاننا، اس کے لئے بہتر نہیں۔ سادہ سی حقیقت یہ تھی کہ محبت اپنی جگہ، لیکن وہ لڑکی اس کے لئے نہیں ہے۔ وہ حیثیت اور مرتبے میں اس سے بہت اوپر ہے۔ وہ مختلف ماحول کی لڑکی ہے۔ اس سے بہتر تو شاید اس کے ملازم ہوں گے۔

سو الٹی بخش مطمئن تھا کہ اسے اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ غیر شعوری طور پر وہ اس کی جستجو کر رہا تھا۔ خود کو سمجھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ بعض اوقات تو آدمی کو برسوں پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے تھوڑا سا غور کر لیا ہوتا تو بات اس کی سمجھ میں آ جاتی۔ مگر اسے تو خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اب نظرں جھکا کر نہیں

سو الٹی بخش مطمئن تھا کہ اسے اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ غیر شعوری طور پر وہ اس کی جستجو کر رہا تھا۔ خود کو سمجھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ بعض اوقات تو آدمی کو برسوں پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے تھوڑا سا غور کر لیا ہوتا تو بات اس کی سمجھ میں آ جاتی۔ مگر اسے تو خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اب نظرں جھکا کر نہیں

بیٹھا، بلکہ نظروں سے چروں کے جھوم کو کھٹکاتا رہتا ہے۔
اپنی کسی تبدیلی کا احساس انسان کو خود نہ ہو تو دوسرے
احساس دلا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔
الٹی بخش کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک گھر میں ساتھ
رہنے والوں کے اور مزدوروں کی ٹولی کے لئے کیسا پیچیدہ معما بن گیا
ہے۔

کوئی دو ہفتے بعد کرامت پھر آیا۔ اس روز الٹی بخش کو کامل
گیا تھا۔ وہ موجود نہیں تھا ”کیا رہا استاد؟ میری بات درست نکلی
تھا؟“ اس نے ٹار سے پوچھا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہے۔“ ٹار نے کہا ”میں نے تین دن
ساڑھے سات بجے صبح یہاں آکر دیکھا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔
سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ میں نے اسے ایک منٹ کے لئے بھی
یہاں سے اٹھتے نہیں دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ وقت وہ
کیسے گزار لیتا ہے۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“
”تو پھر؟“ کرامت نے مایوسی سے کہا ”اور کیا بات ہو سکتی
ہے؟“

”بات تو یہی ہے۔ لیکن یہ چکر کہاں چلا ہے، یہ سمجھ میں نہیں
آتا۔“

”میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ گھر کی طرف تو یہ ناممکن ہے۔ ایسا
سوچنا بھی نہیں۔“

”اور یہاں بھی یہ ممکن نہیں۔“ ٹار نے کہا ”ٹھیک ہے۔
اب میں خود اس سے بات کروں گا۔“

”لیکن اس سے اگلوں آسان نہیں ہو گا استاد۔“ کرامت
بولا ”ہم سب ہر طرح سے کوشش کر چکے ہیں۔“

”میں کچھ اگلوں کا نہیں۔“ ٹار نے کہا ”میں تو صرف اسے
احساس دلاؤں گا کہ بہت لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اس کا کوئی
چکر ہے۔ بس پھر اس کی نظریں ہی کسی دن پورا ہمید کھول دیں گی۔
وہ زبان سے تو نہیں، خود ہی یہ بات بتا دے گا۔“

”واہ استاد، ترکیب تو زوردار ہے۔“ کرامت نے ستائشی
نظروں سے اسے دیکھا۔

تین دن بعد ٹار الٹی بخش کے پاس آ بیٹھا اور اِدھر اُدھر کی
باتیں کرنے لگا۔ قدموں کی چاپ سن کر الٹی بخش نے سر اٹھایا اور
سانے سے گزرنے والی لڑکیوں کے چروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ٹار
نے کچھ دیر اسے اس کا موقع دیا۔ پھر اچانک بولا ”تو نے جواب
نہیں دیا میری بات کا؟“

الٹی بخش نے چونک کر اسے دیکھا ”کون سی بات ٹار بھائی؟“
”تو تو میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔“ ٹار نے خفگی سے کہا۔
”معاف کرنا ٹار بھائی۔ آج کل میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔
دھیان بٹ جاتا ہے اِدھر اُدھر۔“

”ایسا کیوں ہوتا ہے بیٹھے پہلے تو نہیں ہوتا تھا۔“
”ہاں نہیں ٹار بھائی۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہوتا

ہے۔“
”معلوم نہیں ہے یا بتانا نہیں چاہتا۔“ ٹار نے کہا۔
”ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ میں چھپاؤں۔“
”ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں۔“ ٹار نے مہیا نہ انداز
میں کہا ”جس عمر میں تو ہے اس میں ایسی باتیں ہوتی ہیں۔“
اس بار الٹی بخش اپنے چہرے کی تہمتاہٹ پر قابو نہ پاسکا۔ وہ
تہمتاہٹ ٹار نے بھی دیکھ لی ”میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ٹار
بھائی۔“

”اچھا، ایک بات بتاؤ۔ یہ تم گزرنے والوں کو اتنے غور سے
کیوں دیکھتے ہو؟“ ٹار نے اچانک حملہ کیا۔
الٹی بخش بل کر رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اسے
اتنے غور سے دیکھتے ہیں ”یہاں بیٹھ کر کوئی اور کیا دیکھ سکتا ہے ٹار
بھائی۔“ اس نے مدافعتانہ لہجے میں کہا۔
”لیکن پہلے تم لوگوں کو ایسے نہیں دیکھتے تھے۔“
”مجھے تو خیال نہیں۔۔۔۔۔“

”اور خاص طور پر عورتوں اور لڑکیوں کو۔“ ٹار نے کاٹ دار
لہجے میں کہا۔

اس بار تو الٹی بخش کے وجود میں بھونچال آگیا ”من۔۔۔ نہیں تو
ٹار بھائی۔“

”کسی کو تلاش کرتا ہے تو؟“ اس بار ٹار نے مشتعلانہ لہجے میں
پوچھا۔

الٹی بخش کا جی چاہا کہ اعتراف کر لے۔ یوں بوجھ بھی ہلکا
ہو جاتا، جو اب تک وہ تنہا اٹھائے ہوئے تھا۔ لیکن اس صورت
میں اسے پوری بات بتانی پڑتی۔ اور وہ سب کچھ اب خود اسے مضحکہ
خیز لگ رہا تھا۔ وہ ٹار کو بتاتا۔ ٹار دوسروں کو بتاتا۔ پھر اس کا مذاق
اڑتا۔ چنانچہ اس نے زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ”یہ تمہارا دہم
ہے استاد۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“

ٹار خاموش ہو گیا۔ زیادہ دباؤ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے
الٹی بخش کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ لئے تھے۔ پہلی
بار کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔



الٹی بخش اب پھر مضطرب اور بے چین تھا!
اس کی خوش فہمی دور کر دی گئی تھی۔ وہ تو اپنے تئیں ایک بے
ضرر محبت میں مست تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اسے اس چہرے کی
جتنی نہیں۔ اس لئے کہ وہ مل بھی گئی تو کیا ہو گا۔ یوں محبت کرنے
میں تو کوئی نقصان نہیں تھا۔ نہ ہی احساس کمتری کا کوئی سوال تھا۔
لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ یہ اس کے لئے ایک انکشاف
تھا کہ وہ اپنے نیچے پر بیٹھے بیٹھے اسے تلاش کرتا رہا ہے لیکن یہ
حقیقت اس کے شعور سے اتنا نزدیک تھی کہ اسے بہ آسانی تسلیم
کرنا پڑی۔ وہ خود سے بحث بھی نہ کر سکا۔ اسے تو یہ خیال آیا کہ وہ
اس بات سے واقف تھا لیکن اسے خود سے بھی چھپاتا رہا تھا۔

کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لڑکی نے اپنی ساتھی سے کہا ”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نائلہ۔
شام کو آنا شاپنگ کے لئے۔ اتنی گرمی میں ٹھیک سے کوئی چیز پسند
بھی نہیں کر سکو گی۔“

یہ وہ آواز تھی جو دو سو سے زائد دنوں سے اس کے کانوں میں
رس گھول رہی تھی۔ اس آواز کو بھی وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔
”ٹھیک ہے سادی۔“ دوسری لڑکی نے گرمی سانس لے کر
کہا۔

سادی؟ الٹی بخش نے سوچا۔ سادی! یہ کیا نام ہوا بھلا؟ پھر بھی
یہ نام اسے اچھا لگا۔ اس کی طرح مختلف اور اونچا۔

اسی لمحے لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔
دونوں کا تاثر بے حد مختلف تھا۔ ایک طرف وارفتگی اور محبت تھی
تو دوسری طرف کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے لڑکی کسی درخت کو ”دیوار کو“
کسی بے جان چیز کو دیکھ رہی ہو۔

وہ محض ایک پل کی بات تھی۔ لڑکی چلی اور اپنی سہیلی کے
ساتھ چل دی۔ لیکن وہ مختصر سا پل اپنے اندر بہت بڑا پل تھا۔ وہ
پل الٹی بخش کو اداس کر گیا۔ اس نے ہر چیز کا ”ہر بات کا تعین کر دیا
تھا۔ اس کی حیثیت بھی اسے یاد دلادی تھی۔ لیکن وہ اداسی بھی
ایک خوشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے اس نے اسے پایا ہو۔

وہ بڑی محبت سے اسے دوسری لڑکی کے ساتھ جاتے ہوئے
دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اسے کیا ہوا؟ یہ اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔
اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مزدوروں کی ٹولی میں کوئی بھی موجود نہیں
تھا۔ صبح ہی وہ کسی کام پر چلے گئے تھے۔ جو لوگ تھے ان میں کوئی بھی
اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

اس نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھ کر چل دیا۔ اس کے
قدم خود کارانہ انداز میں اٹھ رہے تھے۔ دیر تک اس کی سمجھ میں
نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ اسے بس یہ احساس
تھا کہ وہ چل رہا ہے۔

خاصی دور جا کر بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اور جب سمجھ میں
آئی تو اس کے پورے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ تصور بھی نہیں
کر سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی وہ کسی لڑکی کا تعاقب کرے گا۔ لیکن
ایسا ہو رہا تھا۔ وہ ایسا کر رہا تھا اور وہ اپنے فٹ ماتھ سے کافی آگے
آچکا تھا۔

اس بات کا احساس ہوتے ہی وہ چور بن کر رہ گیا۔ اسے لگتا
تھا کہ ہر شخص ”ہر کاندار اور ہر راہ گیر اسے جھپتی ہوئی نظروں سے
دیکھ رہا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ لڑکی کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ
جانتا تھا کہ اس بات پر لوگوں کے ہاتھوں مرمت شروع ہونے میں
وہ سیکڑ بھی نہیں لگیں گے مگر اس کے قدم کو ”ش“ اور خواہش
کے باوجود نہیں رکے۔ اس نے چاہا کہ پلٹے اور اپنے نیچے کی طرف
واپس چلا جائے۔ لیکن اسے خود پر ذرا بھی اختیار نہیں تھا۔ اس
وقت اس کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اندر ہی اندر

خوف سے لرزتا رہا۔ اس کے قدم بڑھتے رہے۔

دونوں لڑکیاں بائیں سمت مڑ گئی تھیں۔ آگے قطار سے بچلے
تھے۔ تیسرے یا چوتھے بچلے کے گیٹ پر وہ دونوں رک گئیں۔ الٹی
بخش ان سے تھوڑا ہی پیچھے تھا۔ وہ رکنا تو یہ نامناسب بات ہوئی۔
اس نے اپنی رفتار بہت کم... برائے نام کر لی۔

”نائیلہ، آؤ تا میرے ساتھ۔“ لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔
”نہیں سادی، میں اب چلوں گی۔“
”شام کو آؤ گی شاپنگ کے لئے؟“

”نہیں سادی۔ شام کو مجھے می کے ساتھ جانا ہے۔ اسی لئے تو
آج خریداری کرنا چاہ رہی تھی۔“
”تو پھر شاپنگ کری لیتیں۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ پھر سسی۔ اچھا سادی خدا حافظ۔“
”خدا حافظ نائلہ۔“

سادی گیٹ کی طرف چل دی۔ دوسری لڑکی نائلہ آگے بڑھ
گئی۔ اتنی دیر میں الٹی بخش فاصلہ برابر کر کے ان سے آگے نکل گیا
تھا۔ گیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے خوف کے باوجود
سرسری انداز میں گیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ گیٹ کی سائیڈ میں نام
کی تختی لگی تھی۔ شیخ مظفر علی۔ نام کے نیچے بچلے کا نمبر اور علاقے
کا نام لکھا تھا۔

اس لمحے الٹی بخش کا دل اتنے زور سے... اور اس انداز سے
دھڑکا کہ اسے پہلے کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ وہ خوشی بھی ایسی
تھی کہ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ کبھی وہ ایسے خوش ہوا ہو۔ لگتا تھا
کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہے۔ کوئی ایسی انوکھی نعمت جو کبھی کسی کو
نہیں ملتی۔ وہ جیسے گدا سے بادشاہ بن گیا تھا۔

سرشاری کی اس کیفیت میں وہ بہت دھیرے دھیرے آگے کی
طرف چلتا رہا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ دوسری لڑکی نائلہ
اس کے پیچھے آ رہی ہے یا وہ بھی کسی بچلے میں چلی گئی ہے۔ حالانکہ
اس کی وجہ سے وہ آگے بڑھ رہا تھا ورنہ اس کا مقصد تو پورا ہو چکا
تھا۔

آگے سڑک مڑ رہی تھی۔ اب اسے خیال آیا کہ کیا وہ دن بھر
یونہی چلتا رہے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی
بھی نہیں تھا۔ سڑک سنان تھی۔ دوسری لڑکی نچانے کپ اپنے
گھر میں چلی گئی تھی۔ اسے اس کا گھر جانے میں کوئی دلچسپی تھی بھی
نہیں۔ اس نے ایک بار دائیں بائیں دیکھا اور پھر پلٹ کر واپس
چل دیا۔ شیخ مظفر علی کے بچلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس
کے قدم رکے۔ گیٹ بند تھا۔ وہ چند قدم گیٹ کی طرف بڑھا مگر فوراً
ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چل
دیا۔

وہ اپنی جگہ جا بیٹھا۔ وہاں کسی نے اس کی غیر موجودگی کو
محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر بھی وہ خاصی دیر چور سا بنا بیٹھا رہا۔ اس
کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلا ہے۔ وہ اپنی جگہ

بیٹا تصور میں کھوا رہا۔

اس بار اسے تصور میں دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ وہ جیتی جاگتی تصویر تھی کہ ہاتھ بڑھاؤ اور چھو لو۔ اور وہ پیارا سا۔۔۔ خوب صورت مگر عجیب سا نام۔۔۔ سادی! اور وہ بگلا جہاں وہ رہتی ہے۔ وہ بگلا کتنا بڑا ہوگا! یہ وہ تصور نہیں کر سکا۔ کتنا ہی بڑا ہو۔ اس سے وہ مرعوب تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ایبٹ آباد میں زمین بہت دیکھی تھی جو ایک آدمی کی ملکیت ہوتی تھی۔ آدمی چلتے چلتے تھک جائے لیکن زمین ختم نہ ہو۔

اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ اسے بھوک ہی نہیں لگی۔ دھوپ کی دم توڑتی گرمی نے وقت گزرنے کا احساس دلایا تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ شام کی چمپل پھل شروع ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ مزدوروں کی ٹولی واپس نہیں آئی تھی اور یقین تھا کہ اب وہ کل ہی آئیں گے۔ کام نمٹا کر وہ گھری چلے جائیں گے۔

اس نے پھر سر جھکایا اور سادی کے تصور میں گم ہو گیا۔

شام ہوئی اور روز کی طرح بازار آوازوں سے بھر گیا۔ سینڈلوں کی کھٹ کھٹ، قدموں کی چاپیں اور ضد کرتے ہوئے بچوں کی آوازیں۔ لیکن اس روز یہ سب کچھ اسے بالکل اچھا نہیں لگا بلکہ وہ جھنجھلا گیا۔ اس کے تصور میں خلل پڑ رہا تھا۔ وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ اسے خیال بھی نہ آیا کہ اسی رونق کی وجہ سے ہمیشہ وہ دیر تک یہاں بیٹھا رہتا تھا۔ یہ رونق اسے اچھی لگتی تھی۔ اور اب وہ رونق اسے اتنی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آوازیں جو اسے زندگی سے بھرپور لگتی تھیں، اب بے معنی شور و غل لگ رہی تھیں، جن سے سماعت مجروح ہوئی جا رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے اور چیخ کر کہے بند کرو یہ شور و غل۔ مگر اسے احساس ہو گیا کہ وہ فٹ پاتھ پر اپنی خلوت گاہ سجائے بیٹھا ہے۔ یہاں تو یہی کچھ ہوگا۔ خلوت تو بس اپنے گھر میں بند کمرے ہی میں مل سکتی ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اب رونق کی نہیں، تنہائی کی ضرورت تھی۔ آدمی باہر کی دنیا میں رونق اس وقت تلاش کرتا ہے جب اس کے اندر ویرانی ہو، رونق کا نام و نشان نہ ہو۔ اندر دنیا کی دنیا آباد ہو جائے تو پھر باہر کی رونق بری لگتی ہے۔ اندر کی محفلوں میں شرکت کرنے کے لئے، اندر کی دنیا کی سیر کرنے کے لئے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے دل کا دیرانہ تو اب جنت بن گیا تھا۔ اسے رونق سے کیا۔۔۔۔۔

وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی جلدی گھر چلا گیا۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی محفل سجا کر بیٹھ گیا۔ مگر شام ہوئی سورج ڈوبا۔۔۔۔۔ رزق کی تلاش میں نکلنے والے انسانی پرندے اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے تو اسے احساس ہوا کہ یہ بھی گھر نہیں ہے۔ تنہائی یہاں بھی نہیں ہے۔ تو تنہائی ہوتی کہاں ہے۔۔۔۔۔ ملتی کہاں ہے؟

”بخشے۔۔۔ تو کب آیا؟“ کوئی پوچھ رہا تھا۔ اس لئے پوچھ رہا تھا

کہ عام طور پر وہ سب سے آخر میں گھر آیا کرتا تھا۔ ”کیا بات ہے بخشو۔ جلدی آیا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ کسی اور نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

”بس کچھ ایسا ہی ہے۔ سر میں درد ہے۔“ الٹی بخش نے کہا۔ اس پر دوا کے سلسلے میں مشورے ملنے لگے۔ الٹی بخش خاموشی چاہتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ ممکن نہیں۔ سمجھوتا اسے ہی کرنا پڑے گا۔ اسے اپنے لئے وقت تبھی ملے گا جب وہ لوگ سو جائیں گے۔ اس سے پہلے وہ جتنا جھنجھلائے گا، جتنا چڑچڑاہن کرے گا، بات اتنی ہی خراب ہوگی۔ اس کا رویہ خلاف معمول ہوگا تو ساتھیوں کے ذہنوں میں سوالات کلبلائیں گے۔ وہ تجسس کریں گے اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔

”یار۔۔۔۔۔ میں کھانا کھا کر آتا ہوں۔ پھر تاش کھیلیں گے۔“ اس نے کہا اور گھر سے نکل آیا۔

کھانا کھا کر وہ واپس آیا اور تاش کھیلنے بیٹھ گیا۔ اس نے پتے اٹھائے۔ اینٹ کی بیگم پر سادی کا چہرہ تھا ”ذرا رک جاؤ سادی بیگم۔“ اس نے خاموشی کی زبان میں اس سے کہا ”یہ سو جائیں تو ہم تم خوب باتیں کریں گے۔“

اس رات اسے بھری محفل میں تنہا ہونے کا ہنر بھی آیا۔ تصور میں سادی تھی اور وہ تاش کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی غلط پتا چلنے پر اسے ٹوکا بھی گیا۔ مگر سر درد کا بہانہ آڑے آیا۔ اس نے سوچا، چند دنوں میں اس طرح کھیلنے کی مشق بھی ہو جائے گی۔

اور جب سب سو گئے تو وہ سادی کے ساتھ جاگتا رہا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اور وہ اسے نکلے جا رہا تھا۔

”اے۔۔۔۔۔ تمہیں بولنا نہیں آتا کیا؟ منہ میں زبان نہیں ہے؟“ وہ بولی۔

”منہ میں زبان بھی ہے اور بولنا بھی آتا ہے۔“ اس نے جواب دیا ”لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیا بات کروں۔“

”جیسے دوسروں سے بات کرتے ہو ویسے ہی مجھ سے بھی کرو۔“

”تم دوسروں سے بہت مختلف ہو۔ تمہارا مقام، تمہارا مرتبہ اور ہے۔“

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی اور وہ اسے تکتا رہا۔ نجانے کب، کتنی دیر بعد اسے نیند آئی۔ آنکھ کھلی تو گھر دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے نہیں جاگا تھا۔ اسے کوئی اتنی پروا بھی نہیں تھی۔ کام پر تو دیر سے ہی جانا تھا۔ ہاں فٹ پاتھ کی تنہائی سے وہ ضرور محروم ہو گیا تھا۔ پھر اچانک ایک خلش اسے ستانے لگی۔ اس کی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ اس کی تو کوئی طہانی نہیں تھی۔ اور سر میں عجیب سا بھاری پن تھا۔

وہ دن ایک مختلف انداز میں شروع ہو رہا تھا۔ نئے معمولات بن رہے تھے جنہیں عرصے تک چلنا تھا۔

○☆☆○

ٹار نے کن انکلیوں سے الٹی بخش کو دیکھا، جو سر جھکائے کسی

گہری سوچ میں گم تھا۔ نار اس میں آنے والی نئی تبدیلیوں کو دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ یہ معاً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی بخش کو پہلے دن سے دیکھا تھا۔ اس میں تبدیلیاں ایسے آ رہی تھیں جیسے وہ بہت تیزی کے ساتھ مختلف ادوار سے گزر رہا ہو۔

نار نے زندگی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزاری تھی۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزرنے والی زندگی ایک بہت بڑی تعلیم ہوتی ہے۔ ایم اے کی ڈگری بھی آدمی کو اتنا عقل مند اور مردم شناس نہیں بناتی جتنا سڑکیں بنا دیتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر آدمی بہت کچھ دیکھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے سمجھنے لگتا ہے۔ خوشی ہو یا غم اس کے ہر روپ سے وہ واقف ہو جاتا ہے۔ کچھ تو خود پر گزرتی ہے اور کچھ مشاہدہ سکھارتا ہے۔

نار بھی بہت سمجھ دار آدمی تھا۔ وہ حساس بھی تھا۔ اس لئے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بھی اس کا مشاہدہ بہت بہتر تھا۔ اس نے اپنی بخش کو پہلے دن دیکھا تو اس کا تاثر تھا کہ وہ بہت پر خود دار قسم کا آدمی ہے۔ اسے وہ ایک ایسا شخص لگا جو بے وقتی کے احساس تلے دبا جا رہا ہو۔ اس نے سوچا شاید گھر میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہوگی۔ ماں باپ دوسرے بیٹے بیٹیوں کے مقابلے میں اسے بے وقعت سمجھتے ہوں گے۔ بن بھائی دیگر بن بھائیوں کو اس پر فوقیت دیتے ہوں گے۔ اسی لئے اس کے اندر احساس کسری کی حد کو پہنچا ہوا انکسار ہے۔ پھر اپنی بخش خود دار بھی بہت تھا۔ لیکن دوسروں کی عزت کرنا بھی جانتا تھا۔ یہ بات تو نار سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنی بخش کو صرف عشق کرنا سکھایا گیا تھا بلکہ سکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ عشق کرنا تو نہیں سیکھ سکا تھا کہ یہ سیکھنے والی چیز ہی نہیں۔ یہ تو ہو جاتی ہے اور ہو جائے تو آدمی کو سارے آداب خود بخود ہی آ جاتے ہیں۔ ہاں اس کوشش کے نتیجے میں اپنی بخش کو عزت کرنا ضرور آ گیا تھا۔ اور وہ ہر شخص کی عزت کرتا تھا۔ بغیر کسی تفریق کے۔

جس دن استاد قاسم کو رخصت کیا جا رہا تھا، اپنی بخش پورے دن پوری رات ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ اس روز نار نے اسے بہت غور سے اور بہت قریب سے دیکھا تھا۔ استاد قاسم نے مزدوری میں اپنی بخش کا بھی حصہ لگایا تھا۔ نار جانتا تھا کہ اس پر کسی بھی ساتھی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اپنی بخش کو وہ چمکش مہی۔ بہت مہی لگی تھی۔ اس کے نزدیک اس پر اس کا حق نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس نے سامان نہیں ڈھویا تھا۔ وہ رقم لینا اس کی خود داری کی توہین تھی۔ وہ تو فٹ پاتھ کا ساتھی ہونے کے نامے ان کے ساتھ چلا آیا تھا۔ اس لئے بھی کہ قاسم کا وہ بہت احترام کرتا تھا۔ پھر بھی اس نے نہ چاہے ہوئے وہ رقم قبول کر لی۔ یہ صرف عزت کی بات تھی۔ نار نے خود کو اپنی بخش کی جگہ رکھ کر سوچا تھا تو بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ اپنی بخش کے نزدیک وہ رقم لینا اس کی اپنی بے عزتی تھی تو استاد قاسم کے اصرار کے باوجود اس رقم کو قبول نہ کرنا نہ صرف قاسم کی بلکہ پوری ٹولی کی بے عزتی

تھی۔ اس لئے اس نے اپنی بے عزتی گوارا کر کے وہ رقم لے لی تھی۔ لیکن موقع ملتے ہی اس نے اپنی عزت بھی بحال کر لی تھی۔ وہ رقم اس نے اپنے پاس سے اضافہ کر کے لوٹا دی تھی۔ نار ہی کو تو دی تھی اور کتنا اصرار کیا تھا اس کے لئے۔ اور اس طرح کہ کسی اور کو پتا بھی نہیں چلا تھا۔ یہ الگ بات کہ نار نے سب کو بتا دیا تھا۔ یوں ٹولی کے مزدور اپنی بخش کی اور عزت کرنے لگے تھے۔ لیکن نار کو ایک غلط رہی تھی۔ کون جانے اپنی بخش نے اپنی جیب میں کچھ بھی نہ چھوڑا ہو۔ سب کچھ استاد قاسم کے لئے دے دیا ہو۔ اپنی بخش جیسے آدمی سے یہ بعید بھی نہیں تھا۔

نار کو ایک اور منظر بھی یاد تھا۔ جب وہ لوگ ٹھیلے کر استاد قاسم کے گھر پہنچے تھے تو قاسم کی بچیاں بھی ٹھیلے دیکھنے کے لئے بے تاب ہو کر پردے کے پاس آ گئی تھیں۔ اس وقت اپنی بخش کے سوا ہر مزدور کی نظریں پردے کی طرف اٹھی تھیں، چاہے ایسا ایک پہل کے لئے ہوا ہو۔ نار کو وہ بات بری نہیں لگی تھی۔ سب کا ردِ عمل فطری تھا۔ مگر اس میں میلہ پن نہیں تھا۔ لیکن اپنی بخش نظریں جھکا کر بیٹھا رہا تھا۔

اور اپنی بخش تو طارق روڈ کے فٹ پاتھ پر سرسراتے رنگین آنچلوں، لچکتے جسموں، ہلکورے لیتی خوشبوؤں کے درمیان بھی نظریں جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔

پھر اس میں تبدیلی آئی۔ وہ نظریں اٹھا کر نسوانی چہروں کو ٹٹولنے لگا تھا۔ مگر نار کو اس کی وہ نظریں بھی بری نہیں لگیں۔ ان نظروں میں بواہوسی نہیں تھی۔ ایک تڑپ تھی، تلاش تھی۔ جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ ان دنوں وہ بہت بے چین اور کھویا کھویا رہتا تھا۔ کام ملتا تو وہ ٹالنے کی کوشش کرتا۔ جیسے اپنا ٹھکانا چھوڑنا اسے گوارا نہ ہو۔ جیسے وہ یہاں سے اٹھ گیا تو اس کی کوئی قیمتی چیز کھو جائے گی۔

اور اب اس میں ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھانا پھر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ پھر سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ اصولاً نار کو یہ دیکھ کر یہ سوچنا چاہئے تھا کہ اپنی بخش پھر پہلے جیسا ہو گیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بات نہیں ہے۔ پہلے میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پہلے کی جھکی ہوئی نظروں میں اس کا فطری شرمیلا پن تھا۔ جبکہ اب وہ کبھی اتفاقاً نظریں اٹھاتا اور سامنے لڑکیوں عورتوں کا ہجوم ہوتا تو وہ اس کے آ رہا ردِ کھٹا محسوس ہوتا۔ اس کی نگاہوں میں بے نیازی اور طمانیت ہوتی۔ جیسے تلاش ختم ہو گئی ہو۔ جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا وہ اسے مل گیا ہو۔ جیسے اب کسی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ اور وہ سر جھکائے بیٹھا ہوتا، تب بھی اس کے انداز میں اس کے چہرے پر طمانیت ہوتی۔ وہ پہلے والی بے چینی وہ اضطراب ختم ہو گیا تھا۔

ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ اب کوئی کام ملتا تو وہ پہلے سے زیادہ انکساری اور عاجزی سے بات کرتا۔ مثلاً کوئی آیا اور کہا کہ گھر میں رنگ و روغن کرانا ہے۔ درمیان میں وہ جرح کرنے لگا تھا۔

مزدوری سے زیادہ مانگتا۔ کوشش کرتا کہ گاہک اسے چھوڑ جائے۔ کوئی اور کارمگر دیکھ لے۔
اب وہ کہتا ”گرویس گے صاب جی۔“
”کیا لوگے؟“

”وی دہاڑی صاب جی۔۔۔ پچیس روپے روز۔“
”نہیں۔۔۔ دہاڑی کے چکر میں تم لوگ کام لبا کر دیتے ہو۔ میں بہت بھگت چکا ہوں۔“
”تو پھر صاب جی؟“

”تم چل کے گھر دیکھ لو۔ پھر ٹھیکے کی بات کر لیں گے۔“
”اس کی کوئی ضرورت نہیں صاب جی۔ آپ میرے ساتھ بے انصافی تھوڑی کرو گے۔ جو جی چاہے دے دیتا۔“
یہ تقریباً پندرہ دن پہلے کی بات تھی۔ اور ٹار جانتا تھا کہ اس کے بعد سے اب تک الٹی بخش کو کوئی کام نہیں ملا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دہاڑی والے مزدوروں کے ساتھ یہ نرم گرم چلتا رہتا ہے۔ لیکن توازن قائم رہتا ہے۔ کام کے دو تین اچھے دن بے کاری کے چار چھ دنوں کی تلافی کر دیتے ہیں۔ مگر ٹار جانتا تھا کہ الٹی بخش کی بے کاری لمبے عرصے سے چل رہی ہے۔ آخری کام بھی اسے دو ہفتے پہلے ملا تھا۔

ایک خیال نے ٹار کو چوکا دیا۔ وہ اٹھا اور الٹی بخش کے پاس چلا گیا۔ اس کے برابر میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے پکارا لیکن الٹی بخش اپنے آپ میں گم رہا۔ ٹار نے اسے پھر پکارا۔ وہ اسے جھنجھوڑتا نہیں چاہتا تھا۔ اتنی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کسی شخص کو چوکنا کبھی نہیں چاہئے۔
آخر کار چوتھی پانچویں آواز پر الٹی بخش کی محبت ٹوٹی۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کی نظریں ٹار سے ملیں۔
اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ٹار سچ سچ دہل کر رہ گیا۔۔۔۔



زندگی کے اس نئے اور مختلف دور میں الٹی بخش بہت خوش تھا۔ فائدہ مستی کا تجربہ اسے پہلی بار ہوا تھا۔ ایک تصور تھا جو اسے ہر لمحہ سرشار رکھتا تھا۔ اسے کوئی فکر، کوئی پریشانی، کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس کے پاس خوشی ہی خوشی تھی۔ وہ ہر حال میں خوش تھا۔ وہ خود بدل گیا تھا۔ زندگی بدل گئی تھی۔ دن رات بدل گئے تھے۔ معمولات بدل گئے تھے۔ تنہائی تنہائی نہیں تھی اور محفل محفل نہیں تھی۔ اسے کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا۔ کوئی اس سے بات کرتا تو اسے اچھا لگتا۔ جھنجھلاہٹ اس کے مزاج سے خارج ہو گئی تھی۔ وہ رات میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلتا۔ خوب چمکتا، ہنستا بولتا۔ رات کو سب سو جاتے تو وہ دیر تک جاگتا۔ البتہ دیر تک سوئے کی برائی پر اس نے چند ہی دن میں قابو پایا تھا۔ نیند پوری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اتوار کو چھٹی ہوتی اور وہ جی بھر کے سوتا۔
اسے حیرت ہوتی تھی۔ پہلے اس کی دو کمزوریاں تھیں۔ وہ نیند

کا بہت پکا اور بھوک کا بہت کچا تھا۔ مگر اب یہ کمزوریاں دور ہو چکی تھیں۔ اسے عشق کی طاقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس نے سمجھ لیا کہ عشق انسان کی ہر کمزوری دور کر کے اسے عجیب طاقت بخشتا ہے۔ عشق فائدہ مستی سکھاتا ہے۔ ہر حال میں خوش رہنا سکھاتا ہے۔ اور وہ بہت خوش تھا۔

ہر روز نیند پوری کئے بغیر وہ معمول کے مطابق اٹھتا اور فجر کی نماز ادا کرتا۔ اس کے بعد عام دنوں میں وہ کام پر چلا جاتا۔ اور اتوار کا دن ہوتا تو نماز کے بعد دوبارہ سو جاتا۔ صبح سویرے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر وہ سوئے ہوئے گرد و پیش سے ہمیشہ کی طرح مفلوظ ہوتا۔ پھر چہل پہل شروع ہوتی اور وہ کام ملنے کا انتظار کرتا رہتا۔

ایک نیا معمول اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی سوا بارہ بجے کھانے کے لئے اٹھتا۔ ڈیڑھ بجے وہ واپس آتا۔ اسے یہ یاد نہیں ہوتا تھا کہ اس وقفے میں اس نے اس بنگلے کے کتنے چکر لگائے ہیں جس میں سادی رہتی ہے۔ کتنی بار وہ جاتے ہوئے اور آتے ہوئے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا ہے۔ دو ایک بار اس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ پھر اس نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا۔ اتنا کافی تھا کہ اس طرف جاتے ہوئے اس کے قدموں کی کیفیت رقص کی سی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں سادی کا چہرہ ہوتا ہے اور اس کا دل ایسے دھڑکتا ہے جیسے کوئی نغمہ بنا رہا ہو۔ اتنی خوب صورت کیفیت کا سبب معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس تمام عرصے میں اس نے سادی کو ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اگر اسے سادی نظر آگئی تو کیا ہو گا؟ وہ کیا کرے گا؟ سچ تو یہ ہے کہ اب اسے سادی کو دیکھنے کی آرزو بھی نہیں تھی۔ کم از کم وہ تو یہی سمجھتا تھا۔ جس کی تصویر ہر وقت نگاہوں میں بسی رہتی ہو، اس کی جستجو کیا معنی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب پھر سر جھکا کر بیٹھتا تھا۔ اس کی آنکھیں اب رنگین رونقوں کو نہیں ٹٹولتی تھیں بلکہ اب اسے سادی کی مانوس آواز اپنے قریب کہیں سے سنائی دے جاتی تو بھی وہ نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ شاید وہ سیر چشم ہو گیا تھا۔

ایک اور نیا معمول بھی بنا تھا۔ کام نہ ملنے کی صورت میں اب وہ شام سے پہلے ہی گھر چلا جاتا تھا۔ طارق روڈ کی رونقوں میں اب اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ گھر کی تنہائی اس سے بدرجہا بہتر تھی۔ اسے مطالعہ کا شوق بھی ہو گیا تھا۔ کبھی کہیں سے شاعری کی کوئی کتاب مل جاتی تو وہ زیادہ ہی شوق سے پڑھتا تھا۔ عام طور پر وہ ڈائجسٹ پڑھتا تھا۔ کبھی کوئی ادبی ناول یا کتاب مل جاتی تو وہ بھی پڑھتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس کی دنیا وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا ذہن بھی دنیا کی طرح ہوتا جا رہا تھا جو موجود تھا لیکن دریافت کئے جانے کا خطر تھا۔

اس وقت بھی وہ سادی کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ اسے پکارے جانے کا موہوم سا احساس ہوا۔ مگر یوں جیسے فریب سماعت ہو۔ پکار بڑھتی گئی۔ آواز کا جہم بھی بڑھتا گیا تو اس نے نظریں اٹھا کر

کہا۔ اسے حیرت ہوئی۔ ٹار اس کے پہلو میں بیٹھا اسے آواز دے رہا تھا۔

”کیا بات ہے ٹار بھائی؟“ اس نے سادگی سے کہا۔

ٹار کچھ دیر جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ الٹی بخش نے اچانک جو نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں اسے غائب نظر آئی۔ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوئی۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے پہلے یہ خیال کیوں نہیں کیا۔ اسے احساسِ جرم ستانے لگا۔ آنکھوں میں وہ غائب تو اس نے دیکھی تھی مگر اسے گھر میں بھی اور اپنی آنکھوں میں بھی۔ خاصی کوشش کر کے ٹار نے خود کو سنبھالا۔ سوال یہ تھا کہ کیسے کی جائے۔ الٹی بخش کی خودداری سے وہ خوب واقف تھا۔ ملہ بہت نازک تھا۔

”تجھ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا بخش۔“ ٹار نے کہا۔
”یہ نہیں پوچھا کہ وہ کن سوچوں میں گم رہتا ہے“ پر لگتا ہے
”نکل ہو رہا ہوں۔“

”ارے نہیں ٹار بھائی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“

اس دوران ٹار بہت تیزی سے کوئی ترکیب سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے مزید مہلت حاصل کرنے کے لئے ایک اور سانس لیا۔ ”آج کل تو بہت جلدی گھر چلا جاتا ہے؟“
”ہاں ٹار بھائی۔“

”گھر میں کیا دل لگتا ہو گا۔“

”پڑھنے میں دل لگنے لگا ہے ٹار بھائی۔ یہ دیکھو۔“ الٹی بخش اپنے تھیلے میں سے ڈائجسٹ نکال کر دکھایا۔

”اچھی بات ہے۔“ ٹار نے سر ہلا کر کہا۔ پھر بولا ”یار بخش، میں کھانا تیرے ساتھ کھاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اسے بہت سے دیکھ رہا تھا۔

الٹی بخش کا چہرہ فق ہو گیا۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا ”بھی تو بڑا وقت پڑا ہے ٹار بھائی۔“

الٹی بخش کے چہرے کے تاثر نے ٹار کے اندازے کی پکی یقین کردی تھی مگر پوری بات کرنے کے لئے بات آگے بڑھانا پڑی تھا ”ایک بات کہنی ہے تجھ سے۔“ اس نے کہا ”تو سوچے کہ میں بہت بے شرم آدمی ہوں لیکن یار بخش، آدمی جسے اپنا نام ہے اس سے تو بات کر سکتا ہے۔ اس میں تو شرم کی بات نہیں ہے۔ میں تجھے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں۔ تجھ پر تو حق ہے۔ نظریں جھکا کے ہی سہی، تجھ سے تو سوال ڈال سکتا ہوں۔“

ٹار کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی محسوس کر کے الٹی بخش اٹھ کھڑا ”تم مجھ سے ہر بات کر سکتے ہو ٹار بھائی۔“ اس نے کہا ”میں تمہارے درمیان تعلق ہی ایسا ہے۔ میں بھی تمہیں بڑا سمجھتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے کبھی شرمندہ نہیں ہوتے۔“

”بات یہ ہے بخش کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ تیرے سوا میں کسی سے سوال نہیں کر سکتا۔ اور میرا خیال ہے کہ ضرورت کے وقت تجھے بھی میرے سوا کوئی نظر نہیں آتا چاہئے۔“

الٹی بخش کو چکر تو پہلے ہی سے آرہے تھے۔ یہ سن کر تو ایسا لگا، جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ اسے توفانِ مستی میں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنے سخت وقت سے گزر رہا ہے۔ سترہ دن سے اسے کام نہیں ملا تھا اور اس سے پہلے وہ خود کام سے بچتا رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں جو پس انداز کیا تھا وہ بھی بیٹھے بیٹھے کھالیا تھا۔ سترہ دن پہلے جو پیسے ملے تھے وہ اس نے گھر کے پاس جو ہوٹل تھا وہاں دے دیے تھے۔ اس ہوٹل میں وہ ناشتا کرتا تھا اور اب تو باقاعدگی سے رات کا کھانا بھی کھاتا تھا۔ ہوٹل والے کو پیسے دینے کے بعد اس کے پاس بس اتنے پیسے بچے تھے کہ دوپہر کے کھانے اور کرائے کا خرچہ تین دن چل سکتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس دوران اسے کام مل جائے گا اور معاملات ٹھیک ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد سے اب تک کام نہیں ملا تھا۔

الٹی بخش کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کتنے دن سے وہ پیدل آدرا جا رہا ہے۔ کتنے دن سے وہ صرف رات کے کھانے پر گزارہ کر رہا ہے۔ اس لئے کہ ہوٹل سے ادھار کھانا اس کی مجبوری تھی مگر اسے شرمندگی ہوتی تھی۔ ناشتا کرتا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کتنے دن سے اس کی جیب خالی ہے۔

چکر کے ساتھ پیٹ میں اینٹھن بھی ہونے لگی۔ تب اسے یاد آیا کہ آخری بار اس نے کھانا پرسوں رات کھایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پرسوں رات کھانے کے بعد وہ کھاتے میں ادھار لکھوانے گیا تو ہوٹل کے مالک نے پوچھ لیا کہ کیا اسے کام اب تک نہیں ملا ہے۔ حالانکہ ہوٹل والے کا لہجہ خراب نہیں تھا اور انداز دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔ پھر بھی الٹی بخش کو سبکی کا احساس ہونے لگا۔ ناشتا تو وہ ویسے بھی نہیں کرتا تھا۔ اگلے روز وہ رات کا کھانا کھانے بھی نہیں گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ادھار چکائے بغیر وہاں نہیں جائے گا۔

اور اب ٹار کہہ رہا تھا کہ اسے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آج وہ کھانا اس کے ساتھ ہی کھائے گا۔ اس کے ساتھ! اس بات کا تو کوئی امکان ہی نہیں کہ آج وہ کھانا کھائے گا۔ گیارہ بج چکے تھے اور کام ابھی تک نہیں ملا تھا۔

اور ٹار نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کسی اور سے مدد نہیں مانگ سکتا۔ وہ اسے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہے۔

یہ خیال کر کے الٹی بخش کے حلق میں جیسے نمکین پانی کا کوئی چشمہ پھوٹا۔ پل بھر میں اس پانی کو اس کی آنکھوں کی طرف پلکٹا اور جاری ہو جاتا تھا۔ اس نے بہت تیزی سے اس کے آگے ضبط کا بند باندھا پھر بھی آنکھیں نم تو ہو ہی گئیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ وہ چٹکیں نہیں۔

”خاموش کیوں ہو گیا بنٹے؟“ ثار نے اسے چوٹا دیا۔

”کچھ نہیں بھائی“ الٹی بخش نے کہا ”اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ انشاء اللہ کھانا ہم ساتھ ہی کھائیں گے“ اس لمحے اس کی زبان کو چھوئے بغیر دل سے دعا نکلی کہ کام مل جائے۔

”مجھے تو صاف جواب دے نا“ ثار نے اصرار کیا۔
”جواب نہ مانگو استاد تو اچھا ہے“ الٹی بخش نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس احساس نے اس کا حفاظتی حصار توڑ دیا کہ ثار کو مدد کی ضرورت ہے اور وہ اس کی مدد نہیں کر سکتا ”میری جیب تو نہ جانے کتنے دن سے خالی ہے مگر فکر نہ کرو“ اللہ مالک ہے۔“

”تو اتنے دن سے کام کیسے چلا رہا ہے تو؟“
کبھی کچھ نہ بتانے والے الٹی بخش نے صرف شرمندگی میں ڈوبے ہونے کی وجہ سے ثار کو اپنا پورا حال سنا دیا۔

ثار کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتا رہا۔ ایک فٹ پاتھ پر ساتھ بیٹھ کر بھی وہ اس سے اتنا بے خبر تھا۔ جبکہ اسے معلوم تھا کہ اتنے دن سے اسے کام نہیں ملا ہے ”تو نے تو غیریت کی حد کر دی بنٹے“ اس نے خفگی سے کہا ”مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”میرا خیال ہے“ فٹ پاتھ پر بھی کا حال ایک جیسا ہوتا ہے“
الٹی بخش نے سادگی سے کہا۔

”پھر بھی لوگ ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں“ ثار شرمندہ بھی تھا اور خفا بھی۔ الٹی بخش سے بھی اور اپنے آپ سے بھی ”تجھے مجھ کو بتانا تو چاہئے تھا۔“
”لیکن ثار بھائی یہ تو۔۔۔“

”تو نہیں سمجھتا۔ پڑوسی بھوکا رہے تو پڑوسی سے اللہ جواب طلب کرتا ہے۔ وعدہ کر، آئندہ ایسی بات چمپائے گا نہیں۔ کوئی ایک آدمی تو ہر ایک کے لئے ایسا ہوتا ہے جس سے دل کی بات کی جاسکتی ہے۔ تو مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھا کر۔“

الٹی بخش حیرت سے سوچتا رہا کہ یہ ثار اتنا شرمندہ کیوں ہو رہا ہے۔ شرمندہ تو اسے ہونا چاہئے تھا۔

ادھر ثار سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ پیسے تو اس کی جیب میں اس وقت بھی تھے اور وہ الٹی بخش کو دے سکتا تھا۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ضرورت مند بن کر بات نہ کی ہوئی تو الٹی بخش کبھی سچ نہ اگلتا۔ اب وہ اسے یوں پیسے تو نہیں دے سکتا تھا۔ آئندہ کے لئے بات خراب ہو جاتی۔ ثار جانتا تھا کہ الٹی بخش کی طرح اکیلا ہونا کتنی خوف ناک بات ہے۔ آدمی دکھ سے یا بھوک سے سکھ سکھ کر مرجائے لیکن کسی پر انظار نہ کرے۔ وہ الٹی بخش کو دکھ اور مصائب پاٹنا اور کسی کو اپنا سمجھنا سکھانا چاہتا تھا۔

”لیکن ثار بھائی تم تو مجھ سے زیادہ پریشان ہو۔ تم تو بال بچوں والے ہو“ الٹی بخش کہہ رہا تھا۔

ثار نے چونک کر اسے دیکھا ”تو فکر نہ کر۔ مجھے اپنے لئے بھی

کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا ہے۔ تیرے لئے بھی کر لوں گا۔ تو بیٹھ میں ابھی آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ثار اپنی بات کا بھرم رکھنے یعنی پیسوں کا بندوبست کرنے کی غرض سے ایک طرف چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ آیا تو الٹی بخش اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ ثار نے حیرت سے اسے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے الٹی بخش اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں وہ تھمبھلا تھا جس میں وہ اپنے برش وغیرہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش لباس آدمی بھی تھا۔

الٹی بخش ثار کے پاس آکر رکھا ”ثار بھائی“ مجھے کام مل گیا ہے۔ اب چلتا ہوں، کل ملاقات ہوگی“ اس نے چمک کر کہا اور ثار سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ ملانے کے دوران اس کے ہاتھ سے کوئی کانغی چیز ثار کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی۔ پھر الٹی بخش تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

ثار نے حیرت سے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ دس کانٹ تھا، جو الٹی بخش بہت خاموشی سے اسے تھما گیا تھا۔ چند لمحے تو ثار سنائے کی سی کیفیت میں ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے الٹی بخش کو بیکار کرنے کے لئے ہونٹ کھولے۔ مگر ایک احساس نے اسے روک دیا۔ کسی کو مردمانگنا سکھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے مدد لی جائے۔ ثار نے دس کا وہ نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ یہ نوٹ وہ اگلے روز واپس بھی کر سکتا تھا۔ اور یہ جتنا بھی سکتا تھا کہ بھائی کو بھائی سے مدد لینے میں عار نہیں ہونی چاہئے۔

ادھر تیز قدم بڑھاتے ہوئے الٹی بخش بہت خوش تھا۔ رزق دینے والے نے اس کی شرم رکھ لی تھی۔ اس نے کسی سے مدد نہیں مانگی تھی۔ لیکن ثار کے سامنے اعتراف کرنے کے بعد وہ ثار سے کچھ لینے کو منع نہیں کر سکتا تھا اور وہ کچھ لینا بھی نہیں چاہتا۔ اللہ نے اس کی دل سے نکلی ہوئی دعا سن لی تھی۔ ثار کے جاتے ہی وکیل صاحب آگئے تھے۔ وکیل صاحب نے ایک بار پہلے بھی اس سے کام کرایا تھا اور اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ قریب ہی وکیل صاحب کا بہت بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ پچھلی بار انہوں نے اپنی تین دکانوں میں رنگ کرایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار وہ اسے پورے پچھلے کام دیں گے۔

وکیل صاحب نے اس سے کام کی بات کی تو اس نے کہا۔ ”وکیل صاحب، ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانیں گے؟“

وکیل صاحب چونکے۔ انہوں نے سوچا، شاید یہ زیادہ مزدوری کی بات کرے گا۔ پھر بھی انہوں نے کہا ”بولو، کیا بات ہے؟“

”صاحب جی، مجھے پندرہ روپے پیشگی دے سکتے ہیں؟“

وکیل صاحب نے جیب سے بیس روپے نکال کر اسے دے دیے۔ یوں عزت رہ گئی۔

سو اب الٹی بخش کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ شکر گزاری کے بعد تو یہ کا وقت آیا۔ الٹی بخش کی سمجھ میں آیا کہ پچھلے دنوں اس نے کام ٹھکرا ٹھکرا کے بہت نا شکر اپن کیا ہے ورنہ اس پر

یہ وقت ہی نہیں آتا۔ اور اللہ نے تو اس ناشکرے پن کے باوجود اس کی حاجت روا کی فرمائی ہے۔
بے شک وہ بڑا رحم والا۔ نہایت مہربان ہے۔ اور سب توفیق اسی کے لئے ہیں۔

○☆○

وکیل صاحب کا کام دس دن میں ختم ہوا اور الہی بخش کے بارے دلدرد دور ہو گئے۔ ہوٹل کا حساب چکلا اور جیب بھی بھاری ہو گئی مگر اسے ایک بڑا سبق مل گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کام کو کبھی نہیں ٹھکرائے گا۔
لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بارے میں اوپر کچھ اور فیصلہ ہو چکا ہے!

اس روز وہ معمول کے مطابق سوا بارہ بجے اٹھا۔ کھانا کھا کر وہ سادی کے گھر کی طرف چل دیا جہاں وہ گزشتہ دس دن سے نہیں جا سکا تھا۔ شاید اسی لئے اس روز اس کے قدموں میں دھمال کی سی کیفیت تھی۔

شیخ منظر علی کے بچنے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اگر کبھی اس بچے کا گیت اس کے لئے کھل جائے تو کیا ہو۔ اس نے فوراً ہی اس فضول خیال کو ذہن کے کسی نماں خانے میں حکیل دیا۔ نہ کبھی ایسا ہوتا تھا اور نہ ہی اسے ایسی کوئی خواہش تھی۔

معمول کے مطابق وہ اس موڑ تک گیا، جہاں سڑک زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دونوں جانب مڑتی تھی۔ وہاں سے وہ واپسی کے لئے پلٹا۔ وہ پلٹا تو ہمیشہ کی طرح شیخ صاحب کے بچنے کے سامنے والے فٹ پاتھ پر تھا یعنی اس کے اور بچنے کے درمیان سڑک مائل تھی۔

وہ کوئی بیس گز چلا ہو گا۔ وہاں آئس کریم اور ٹھنڈی بوتلوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اسی وقت پانچ سال کا ایک لڑکا ایک بڑے شخص کے ساتھ سڑک پار کرنے کے ارادے سے فٹ پاتھ سے سڑک پر اترا۔ بچے نے بڑے کی تنگی تو نہیں دیکھی ہوئی تھی، لیکن انداز بتاتا تھا کہ دونوں ساتھ۔

اسی لمحے موڑ کی طرف سے کسی گاڑی کے ٹائر سڑک سے ٹوٹنے اور چرچانے کی آواز سنائی دی۔ کچھ چرچاہٹ برکتوں کی تھوڑی سی بھی تھی۔

الہی بخش نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سرخ رنگ کی کار موڑ سڑک کی سڑک پر آ رہی تھی۔ گاڑیاں تو تے درجے کے موڑ ایسی رفتار سے نہیں کاشتیں۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی سڑک کی دوسری سائیڈ تک پہنچ گئی تھی اور اب وہ یوں ٹھہر رہی تھی جیسے کوئی شرابی کرنے کے بعد اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے ٹھہرا ہے۔ اس کی رفتار اب بھی بہت زیادہ تھی۔

الہی بخش کی نظریں سڑک کی طرف اٹھیں۔ بڑھا اور بچہ اس

وقت سڑک کے مین وسط میں تھے۔ انہوں نے گاڑی کی توازن بھی سن لی تھی اور بے قابو گاڑی کی طرف حوجہ تھے۔ پھر انہوں نے سڑک پار کرنے کے بجائے واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے کہ گاڑی رانگ سائیڈ پر آئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پلٹے اور اسی طرف لپکے جہاں الہی بخش کھڑا تھا۔

ادھر گاڑی سبھل کر اب درست سائیڈ کی طرف آ رہی تھی! الہی بخش کو صورت حال کی تکفنی کا احساس ہو گیا تھا۔ گاڑی کی جو رفتار تھی اس سے ان تک پہنچنے میں گاڑی کو ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہ ملا۔ ان دونوں کے پاس نہ اب پلٹنے کی سلت تھی اور نہ وہ گاڑی سے بچ کر ادھر آ سکتے تھے۔

فیصلہ کرنے کی بھی سلت نہیں تھی۔ گاڑی اسی رفتار سے جھپٹی چلی آ رہی تھی۔ ان دونوں نے بھی دیکھ لیا تھا اور اب خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ الہی بخش نے تیزی سے جست لگائی۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اسے صرف احساس ہوا کہ گاڑی بالکل اس کے سر پر آ پہنچی ہے۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنے ہاتھ پھیلا کر حکیلے اس کے ہاتھ دو جسموں سے ٹھکرائے ساتھ ہی گاڑی اس کے جسم سے ٹھکرائی۔ اس نے خود کو فضا میں اڑتا محسوس کیا۔ سڑک پر گرنے تک وہ اپنے حواس میں تھا۔ مگر پھر اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ آٹھ کھلی تو وہ جنت میں تھا!

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ سادی روٹی سے اس کی پیشانی صاف کر دی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی پیشانی پر زخم ہے جس سے خون رس رہا ہے لیکن یہ احساس فوراً ہی معدوم ہو گیا۔ خوشی تکلیف سے زیادہ ہوئی تھی۔ پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہاں تک کیسے پہنچا ہے۔ اتنا اسے یاد تھا کہ اس نے ایک بڑے اور بچے کو بے قابو کار سے بچانے کی کوشش کی تھی اور خود گاڑی کی پریٹ میں آ گیا تھا۔

”تم بہت من مانی کرتی ہو سادی۔“ کسی نے کہا ”واکڑے والے“
”ہاں۔ وہ دیکھ لے گا۔ تم خواہ خواہ واکڑی دکھاری ہو۔“

الہی بخش نے سر گھما کر دیکھا اور اس خاتون کو بھی پہچان لیا۔ اس نے پہلی بار سادی کو دیکھا تو یہی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ جیتنا اس کی ماں تھی۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ سادی کا نام سادی ہے۔ پھر انا م سادی ہے۔ لیکن سادی کتنا اچھا لگتا ہے۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں امی۔“ سادی نے کہا ”واکڑے انتظار میں یونسی چھوڑ دیا جائے۔ کم از کم زخم کی صفائی تو کی جاسکتی ہے۔“

”اچھا بھئی، جوتی چاہے کرو۔“
الہی بخش لینے لینے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کس حد تک زخمی ہے۔ اس نے ہاتھ ہلائے۔ ٹانگوں کو حرکت دی۔ گھٹنوں کے نیچے کچھ تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ سر اور پیشانی بھی

دکھ رہے تھے۔ اور کہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ وہ گاڑی کے عین سامنے تھا۔ اصولاً گاڑی کو اس کے اوپر سے گزر جانا چاہئے تھا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی۔ آخری ٹاپے میں ڈرائیور گاڑی کو اس سے دور کاٹنے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔ وہ گاڑی کی سائیڈ سے ٹکرایا ہوگا۔ اسی لئے وہ فضا میں اچلا تھا اور سر کے بل گرا تھا۔ یعنی خدا نے کرم کیا تھا۔ بہت سستے میں جان چھوٹ گئی تھی۔

جان چھوٹ گئی تھی! اور انعام کتنا بڑا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس وقت وہ سادی کے گھر میں ہے، جس کے گیٹ سے گزرنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”حم۔ ڈاکٹر بھی آگیا۔ اب ہٹ جاؤ۔“ سادی کی ماں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہی بڑھا شخص ڈاکٹر کا بیگ اٹھائے ہوئے تھا جسے اس نے دھکیلا تھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر تھا۔ سادی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب الٹی بخش نے دیکھا کہ وہ پٹنگ کی سائیڈ میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ ”بیٹھے ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے مترنم آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ تکلیف کہاں کہاں ہو رہی ہے۔ پھر اس نے اسے چیک کیا ”تشویش کی کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ۔“ اس نے سادی کی ماں سے کہا ”معمولی چوٹیں ہیں۔ البتہ سر کی اندرونی چوٹ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ میں دوائیں لکھ رہا ہوں۔ منگوائیں۔ مریض کو آرام کی ضرورت ہے۔ ہاں اسے تے ہویا مٹی کی شکایت کرے تو مجھے فوراً بلوائیجئے گا۔“ بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر کو فیس دی۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر کا لکھا ہوا نسخہ بڑے شخص کو دیا ”جاؤ کرم موچا چا“ یہ دوائیں لے آؤ۔“

کرمو کے جانے کے بعد وہ الٹی بخش کی طرف مڑیں ”تو الٹی بخش ہے تمہارا نام۔“

”جی بی بی صاب۔“

”رہتے کہاں ہو؟“

”معلم ہستی میں۔“

”یہ کہاں ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔ پھر بے نیازی سے کہا۔ ”خیمہ۔ ہوگی کہیں۔ یہ بتاؤ ماں باپ کے ساتھ رہتے ہو۔“

”جی نہیں۔ وہ سب تو امیٹ آباد میں ہیں۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔“

”یہ اور بھی اچھا ہے کیونکہ تمہیں کل تک تو یہاں رہنا ہی ہوگا۔ ماں باپ ہوتے تو اور پریشانی ہوتی۔“

الٹی بخش کو ان کا لہجہ اور انداز اچھا نہیں لگا۔ لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

”تم کرتے کیا ہو؟“ اس بار سوال سادی نے کیا تھا۔ ”رنگ و دفرن کا کام کرتا ہوں۔“ اس نے سادی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”یہاں قریب ہی فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہوں۔“

”گینے لہنی کے پاس۔“

سادی کی آنکھیں ایک پل کو چمکیں ”ہاؤ ویری رو میٹھ۔“ اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ زندگی ہے ہی بہت رومانوی چیز۔“ الٹی بخش نے سادی سے کہا۔

سادی کی آنکھیں پھیل گئیں ”پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔“ ”جی نہیں۔ میٹرک کے بعد تعلیم چھوڑ کے زندگی کی رومانویت کھونجے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔“

بیگم صاحبہ کی پیشانی کی شکنیں اور گہری ہو گئیں ”اب چلو بھی سادی۔“ انہوں نے ترش لہجے میں کہا ”ہر ایک سے باتیں کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔“

سادی بیگم صاحبہ کے ساتھ چل دی۔ دروازے پر پہنچنے کے بعد اس نے پلٹ کر الٹی بخش کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں معذرت تھی۔ بیگم صاحبہ اس وقت تک باہر نکل چکی تھیں ”سنو الٹی بخش، کرمو چاچا تمہارا خیال رکھے گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر محلی محسوس ہو تو فوراً کرمو چاچا کو بتا دینا۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

وہ دونوں چلی گئیں۔ الٹی بخش نے آنکھیں موند لیں۔ سادی واپس آگئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں ”یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟“ اس نے خود کلامی کی۔

”عشق کی تربیت دی جا رہی ہے تمہیں۔“ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔

”یہ کیا عشق ہے کہ میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا؟“ ”عشق میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔“

اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ سادی پھر آگئی۔ اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ نجانے کیسے۔ لیکن زندگی میں پہلی بار وہ دن میں ہی سو گیا۔



اس بار آنکھ کھلی تو کرم دین اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس سے بات ہوئی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ درحقیقت اتفاقات کا اسیر ایک ایسا شخص ہے جسے کوئی انجانی قوت کسی خاص سمت میں لئے جا رہی ہے۔

یہ بات کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ بڑھا کرم دین بھی امیٹ آباد ہی کا رہنے والا ہے ”تو امیٹ آباد میں کہاں رہتا ہے بیٹے؟“

”بانڈو، بٹنگ میں چاچا اور تم؟“

”میں شیٹا بانڈی کا ہوں۔“ کرم دین کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”باپ کا تیرے کیا نام ہے؟“

”پیر بخش۔“

پتا چلا کہ کرم دین اس کے باپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ برسوں۔۔۔ برسوں پہلے دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے۔ دیر تک کرم دین پیر بخش کے بارے میں معلوم کرتا اور اپنے اور اس کے لڑکپن کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے بڑی شفقت سے کہا ”تو تو دیسے ہی میرے لئے بیٹے کی طرح ہے۔ میری جان بچا کر تو تو گئے بیٹے

سے زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو چاچا۔“ الٹی بخش نے شرم ساری سے کہا۔

”اور وہ بچہ جو میرے ساتھ تھا، وہ اس گھر کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بہت لاڈلا۔ دو ہی بچے ہیں ان لوگوں کے۔ سادی بی بی اور اظہر بیٹا۔“

”بچے کو چوٹ تو نہیں آئی؟“

”خراش بھی نہیں آئی۔ وہ تو اللہ نے تجھے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا ورنہ میرے اور اس کے بچنے کا سوال ہی نہیں تھا۔“ کرم دین کہتے کہتے رکا۔ پھر بولا ”یہ اظہر بابا بڑی منتوں مرادوں کا بچہ ہے۔ تجھے اندازہ ہی نہیں کہ تو نے ان لوگوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔۔۔۔۔“

”احسان کرنے والی تو اللہ کی ذات ہے چاچا۔“ الٹی بخش نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

”ٹھیک ہے لیکن عزت تو دوسیلے کی بھی ہوتی ہے۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ کسی کا احسان کبھی نہیں بھولتے۔“

”پر بیگم صاحبہ تو ایسے بات کر رہی تھیں، جیسے میں کوئی مصیبت یا بوجھ ہوں۔ اگر مجھے۔۔۔۔۔“ الٹی بخش نے بروقت خود کو روک لیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اگر اس گھر میں سادی نہ ہوتی تو وہ فوراً ہی وہاں سے نکل جاتا۔

”بس بیگم صاحبہ ایسی ہی ہیں۔“ کرم دین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ ہم جیسوں کو انسان ہی نہیں سمجھتیں وہ۔ پر صاب بہت اچھے ہیں اور بچے بھی۔ بڑی عزت دیتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو شاید پیسے کا گھمنڈ ہے۔ سب نوکروں سے ایسے ہی بات کرتی ہیں۔“

”پر میں نوکر تو نہیں ہوں ان کا۔“

”چھوڑ ان کی بات۔ صاب آئیں تو دیکھنا۔ اب تو یہ دوا کھا۔“

الٹی بخش نے پانی کے ساتھ گولی نگل لی ”تو یہ ہے ان کا بگلا۔۔۔۔۔“ وہ بڑبڑایا۔

”بگلا کہاں پنگے۔ یہ تو میرا کوارٹر ہے۔ ایک حصے میں نوکروں کے لئے کوارٹر بنوا دیے ہیں۔ بگلا تو بہت بڑا ہے۔ کل دیکھنا۔“

الٹی بخش نے اِدھر اُدھر دیکھا ”میں یہاں سوؤں گا تو تم کیا کرو گے؟“ اس نے پوچھا۔ ”چارپائی تو یہاں ایک ہی ہے۔“

”تو اس کی فکر نہ کر۔“

”چاچا۔۔۔ میں گھر ہی نہ چلا جاؤں۔ اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”بے کاری کی باتیں نہ کر۔ صاب سے ملے بغیر تو نہیں جاسکتا۔ چلا گیا تو صاب بہت خفا ہو گا مجھ سے۔ یہ بات نہ ہوتی تو بیگم صاحبہ نے ہی چلا کر دیا ہوتا تجھے۔“

الٹی بخش یہ سن کر مسکرایا ”تو یہ بات ہے۔“

”میں نے کہا نا کہ صاب بہت اچھا آدمی ہے۔“

دیر تک وہ اس گھر کی کراچی کی اور ایٹ آباد کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کر مو کھانا لے آیا۔ دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کے دوران الٹی بخش نے پوچھا ”تم یہاں کیا کرتے ہو چاچا؟“

”میں مالی ہوں اور باہر سے سدا سلف بھی لاتا ہوں۔ پورے پندرہ سال سے ہوں یہاں۔ صاب بہت اعتبار کرتے ہیں مجھ پر۔ مجھے نوکری چھوڑ کر جانے ہی نہیں دیتے۔ وہاں میرے بیٹے اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ وہ مجھے بلاتے ہیں کہ اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پر صاب مجھے نہیں چھوڑتے۔ سال دو سال میں کچھ دن بچوں کے ساتھ گزار آتا ہوں۔“

کھانے کے بعد الٹی بخش نے دوالی اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے نیند آگئی۔



شیخ مظہر علی رات دس بجے گھر پہنچے۔ شام کو انہوں نے گھرفون کر کے بتا دیا تھا کہ ایک اہم مینٹنگ کی وجہ سے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ کھانے پر ان کا انتظار نہیں کیا جائے۔ وہ پہنچے تو سادی انہیں جاگتی ملی۔ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا ”پاپا، آپ تو جلدی آگئے۔“

”کیا بات ہے بیٹی۔ واپس چلا جاؤں؟ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟“ شیخ صاحب نے صوفے پر بیٹھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

”آپ جانتے ہیں پاپا کہ یہ بات نہیں۔“ سادی ٹھنک کر بولی۔ ”آپ نے کہا تھا کہ دیر سے گھر آئیں گے، ہم نے کھانا کھالیا۔ اتنی دیر تو ہم انتظار کر سکتے تھے۔ ساتھ ہی کھالیتے کھانا۔ صرف دس ہی تو بجے ہیں۔“

شیخ صاحب مشخانہ انداز میں مسکرائے ”مجھے اور دیر بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تو اتفاق ہے کہ میں جلدی چلا آیا۔“

”کھانا لگو اؤں آپ کے لئے؟“

”بھوک نہیں ہے۔ البتہ کافی پلوادو۔“

سادی اٹھ کر گئی اور ملازمہ جمیلہ کو کافی کے لئے کہہ آئی۔ وہ پھر باپ کے پاس آ بیٹھی ”تمہاری می کہاں ہیں؟“ شیخ صاحب نے پوچھا۔

”اوپر اپنے بیڈروم میں، سر میں درد ہو رہا تھا۔ نیند کی گولیاں لے لی ہیں۔“

”سر کے درد کا علاج نیند کی دوا لے کر سوجانا تو نہیں۔“ شیخ

صاحب نے کہا ”مگر وہ بات کہاں سنتی ہیں۔“

سادی کو ان کے لہجے کی بے بسی بردھ ہوئے لگا۔ اس نے تو

بچپن سے ہی ماں باپ کو لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ امی کے مزاج میں سرکشی بہت تھی۔ وہ پاپا کی کوئی بات نہیں مانتی تھیں۔ پاپا میں بھی برداشت کا مادہ نہیں تھا۔ شکر تھا کہ مار پیٹ کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن امی اور پاپا میں کئی دن تک بات چیت بند رہتی تھی۔ پھر

اٹھ کر پیدائش کے بعد پاپا بہت متحمل مزاج ہو گئے اور ای اور چڑھی اور بد مزاج ہو گئیں۔ شاید اس لئے کہ پاپا اب ان سے لڑنے بھی نہیں تھے۔

”دور اٹھ کر کہاں ہے؟“ شیخ صاحب نے کافی کا کھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ جیلہ چند لمبے پہلے کافی کی پیالی ان کے سامنے رکھ گئی تھی۔

سادی نے ان کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں گہری ہوئی تھی۔

”بہن! اٹھ کر کہاں ہے؟“ شیخ صاحب نے دہرایا۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی۔ اٹھ کر ہر حال میں ان کا انتظار کرتا تھا۔ چاہے رات کے باہر بج جائیں۔

”اٹھ کر؟“ سادی نے چونک کر سر اٹھایا ”وہ سو رہا ہے پاپا۔ ڈاکٹر نے اسے ٹریکولائزر دیا تھا۔“

اب کے چونکنے کی باری شیخ صاحب کی تھی ”کیوں بھی۔ کیا ہوا اسے؟ خیریت تو ہے؟“ انہوں نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

”تو کیا امی نے آپ کو نہیں بتایا؟“

”کیا نہیں بتایا؟“ شیخ صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

سادی کو اس بار امی کے روپے پر شدید غصہ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ امی نے فون پر پاپا کو حادثے کے متعلق بتا دیا ہوگا۔ اسے تو حیرت ہوئی تھی کہ پاپا فوراً ہی دوڑے کیوں نہیں آئے۔ پھر اس نے سوچا۔ شاید اس لئے کہ اٹھ کر خراش بھی نہیں آئی ہے ”پاپا۔۔۔ اٹھ کر آج ایک جان لیوا حادثے میں بال بال بچا ہے۔“

شیخ صاحب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہ زبوں کی طرف لپکے۔ لیکن سادی نے انہیں پکار لیا ”پریشانی کی کوئی بات نہیں پاپا۔ اسے خراش بھی نہیں آئی ہے۔ اس وقت وہ بے خبر سو رہا ہوگا۔ صبح دیکھ لیجئے گا اسے۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو نا؟“ شیخ صاحب کے لہجے میں التجا تھی۔

”ہاں پاپا، آپ آرام سے بیٹھ کر کافی پیئیں۔ اٹھ کر معمولی سی چوٹ بھی آئی ہوتی تو میں اتنے سکون سے بیٹھی ملتی آپ کو؟“ سادی کے لہجے میں شکایت تھی۔

بات درست تھی۔ شیخ صاحب نے فحالت سے بیٹی کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ واپس آ بیٹھے ”ہوا کیا تھا؟“ انہوں نے پوچھا۔ کافی کی پیالی کو وہ بھول ہی گئے تھے۔

”تفصیل تو مجھے نہیں معلوم پاپا۔ کرمو چا چاہتا سکتے ہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ ایک اجنبی انہیں بچاتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔ اس کو بھی معمولی چوٹیں آئیں۔“

”اسے بھی تھوڑی سی زخمی ہوئی؟“ شیخ صاحب نے کچھ احسان کر کے ٹال دیا ہوگا؟“

شیخ صاحب کے لہجے میں کٹنگ تھی۔

”راہ تو یہی تھا ان کا۔ لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ وہ کرمو چا چاکے کو وارنٹ میں ہے۔“

”تم بہت پیاری بیٹی ہو مہر۔“ شیخ صاحب نے اٹھتے ہوئے

کہا ”میں ذرا اسے دیکھ آؤں۔“

”پاپا، میں جیلہ کو بھیج کر انہیں بلوالیتی ہوں۔۔۔۔۔“

”میں سادی بیٹی، مجھے خود جانا چاہئے۔“ یہ کہہ کر شیخ صاحب باہر چلے گئے۔ سادی پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔ امی اور پاپا کتنے مختلف ہیں ایک دوسرے سے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دو افراد جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنی ہوتی ہے، وہ خوف ناک حد تک ایک دوسرے کے برعکس کیوں ہوتے ہیں۔ اب تو اسے شادی سے خوف آتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔

ادھر ہلکی سی دستک پر کرم دین نے دروازہ کھولا تو شیخ صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا ”صاب جی آپ؟ مجھے بلوالیا ہوتا۔“

”میں اس سے ملنے آیا ہوں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے سوتے ہوئے الٹی بخش کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوش رو جوان تھا۔ پتلا ناک نقشہ، کشادہ پیشانی اور پیشانی پر بہت گہرے زخم کا نشان۔ انہیں حیرت ہوئی کہ وہ نشان بد نما نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ لگتا تھا کہ وہ اس کے وجود کا ایک اہم حصہ ہے۔

”ارے یہ تو سو رہا ہے۔“ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”جی صاب جی۔“

”تم ذرا میرے ساتھ آؤ کرمو۔“

کرم دین دروازہ کھول کر ان کے پیچھے نکل آیا۔ وہ اسے باغیچے میں لے گئے۔ وہاں گارڈن چیئرز پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے ”بیٹھو کرمو۔“

کرمو نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔

”اب مجھے سب کچھ بتاؤ۔“

کرم دین نے بتایا کہ کس طرح وہ اٹھ کر پاپا کے ساتھ سڑک پار کر رہا تھا کہ وہ گاڑی موڑے سے اس طرف آئی۔ آواز سے اندازہ ہو گیا تھا کہ گاڑی کی رفتار خطرناک ہے گاڑی مڑتے ہوئے اپنے گھر والی سائیڈ پر تھی صاب جی۔ رفتار بہت تیز تھی اور فاصلہ کم، ہم اس وقت سڑک کے بیچ میں تھے۔ اٹھ کر پاپا ڈر کر پلٹے کہ دوسری طرف واپس چلے جائیں۔ میں بھی ان کے ساتھ پلٹا۔ اتنی دیر میں گاڑی نے رخ بدل لیا۔ دوسری سائیڈ۔ صاب جی، ہم دونوں ڈر کے مارے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ہل بھی نہیں سکے اور گاڑی تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی۔ کھڑے رہنے میں تو پھر بھی شاید بچت ہو جاتی مگر پاپا آگے کی طرف جانے والے تھے اور میں انہیں روک بھی نہیں سکتا تھا۔ بس صاب جی، ایسے میں یہ الٹی بخش فرشتہ بن کر آیا۔ اس نے جھپٹ کر ہم دونوں کو دھکا دیا۔ ہم گر گئے۔ یہ گاڑی کی لپیٹ میں آیا۔ وہ تو شکر ہے کہ ڈرائیور نے مین وقت پر گاڑی کو دوسری طرف گھما دیا۔ ورنہ یہ کچلا جاتا صاب جی۔ پھر بھی یہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نوکروں سے اٹھوا کر اسے کوارٹر میں لے آیا۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ وہ بولتا ہے معمولی چوٹیں ہیں کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔“

شیخ مظهر علی کے جسم میں واضح طور پر تھر تھراہٹ نظر آئی ”اور

وہ گاڑی؟

”وہ نہیں رکی صاب۔ میرا خیال ہے، بریک لیل ہو گئے تھے اس کے۔“

شیخ صاحب تصور میں کرم دین کا بیان کیا ہوا پورا منظر دیکھ رہے تھے ”واقعی اللہ نے بڑا کرم کیا۔ اس لڑکے کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔“ ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

”صاب جی بعد میں پتا چلا کہ یہ اپنے ایسٹ آبادی کا ہے۔ اس کے باپ کو میں جانتا ہوں برسوں سے۔“

”ہم“ شیخ صاحب نے پُر خیال لہجے میں کہا ”تو پھر کیا ہونا چاہئے۔“

”صاب جی، آپ ایک ڈرائیور رکھنے کو کہہ رہے تھے۔“ کرم دین نے یاد دلایا۔

شیخ صاحب نے سعدیہ سے اس کے لئے کار خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ کم از کم فی الحال یہ نہیں چاہتے تھے کہ سعدیہ ڈرائیور کرے۔ اس لئے ڈرائیور کی ضرورت تھی۔ ڈرائیور رکھے بغیر وہ کار نہیں خریدنا چاہتے تھے اور یہ ان کی فطرت تھی کہ اعتبار بہت دیکھ پرکھ کے کرتے تھے اور جب کرتے تھے تو اندھا اعتبار کرتے تھے۔

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ لڑکا ڈرائیونگ جانتا ہے؟“

”ہزارے میں تو بچپن میں ہی ڈرائیونگ آجاتی ہے صاب۔“

کرم دین نے فخریہ لہجے میں کہا۔

شیخ صاحب چند لمحے سوچتے رہے ”نہیں، ابھی یہ مناسب نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”یہ بتاؤ کہ یہ کام کیا کرتا ہے؟“

”رنگ و روغن کا بہت اچھا کاریگر ہے صاب۔“

”اور تم اسے ڈرائیور بنانا چاہتے ہو۔“ شیخ صاحب کے لہجے میں ملامت تھی ”خیر اسے جانے نہ دینا۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھنا۔ کل ڈاکٹر کو بھی بلا لانا۔ اگر وہ ٹھیک ہو گیا ہو تو کل شام اسے میرے پاس لے آنا۔ میں جلدی گھبراؤں گا۔ دیکھیں گے کچھ۔“ شیخ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ”اب تم آرام کرو۔“

○☆☆○

اکلی صبح ناشتے کی میز پر شیخ صاحب ننھے انہرے ملے انہوں نے انہرے بھی حادثے کی تفصیل سنی ”بس پاپا گاڑی ہم پر چڑھنے والی تھی کہ انہوں نے ہمیں دھکا دے دیا۔“ انہرے جو نقشہ کھینچا وہ اور خوف ناک تھا۔

شیخ صاحب نے ملامت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا ”اور آپ نے فون پر مجھے یہ بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔“

”کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔“

رخسانہ بیگم نے بے پروائی سے کہا۔

”جب تک کوئی مرنہ جائے“ آپ کے خیال میں حادثہ سنگین نہیں ہوتا۔“ شیخ صاحب نے سرد لہجے میں کہا ”یہ تو بڑی خطرناک

بات ہے۔ اللہ کو ناراض کرنے والی۔“

”ارے یہ لوگ بڑھا چڑھا کر سنار ہے ہیں۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ پھر چند لمحے کے توقف کے بعد بولے ”میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس گھر کو رنگ و روغن کی ضرورت ہے۔“

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے اس رنگ ساز کا احسان چکائیں گے۔“ رخسانہ بیگم نے تڑپ سے کہا۔

”تو احسان ماننا کوئی بری بات ہے۔“

”احسان کیسا۔ ٹھیک ٹھاک ہے وہ۔ ماتھے پر ذرا سی خراش آئی ہے بس۔“

”پھر وہی بات۔ وہ مرجاتا یا اپاچ ہو جاتا، تب آپ اس کا احسان مانتیں۔“ شیخ صاحب نے گہری سانس لے کر کہا ”یہ بھی سن لیجئے کہ یہ کوئی احسان کا صلہ نہیں ہوگا۔ وہ کام کرے گا اور اجرت لے گا۔ احسان تو عمر بھر نہیں اتارا جاسکتا۔ یہ سب چھوٹے پن کی باتیں ہیں۔“

”کرتے رہیں جو جی میں آئے۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں چھوٹے لوگوں کو ذرا سی بات پر سر پر بٹھالینا چھوٹا پن ہے، جسے آپ بڑائی سمجھتے ہیں۔“ رخسانہ بیگم نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور ناشتے کی میز سے اٹھ گئیں۔

شیخ صاحب نے بات کو برعہانا مناسب نہیں سمجھا۔ جانتے تھے کہ اس سے تقنی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

○☆☆○

ناشتے کے بعد کرم دین ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کر کے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ دن میں تین بار مرہم لگایا جائے۔ پیشانی کا زخم دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔

”چاچا، اب میں چلتا ہوں۔“ ڈاکٹر کے جانے کے بعد الٹی بخش نے کہا۔

”نا بیٹے۔ صاب جی سے ملے بغیر تو نہیں جاسکتا۔“

”وہ ایک مینے نہ ملے تو کیا میں بیس پرار ہوں گا؟“

”وہ تو کل رات ہی تجھ سے ملے آئے تھے۔ تو سو رہا تھا۔ تجھے دیکھا اور چلے گئے۔“

الٹی بخش کے دل میں ان دیکھے شیخ صاحب کے لئے قدر و منزلت کا جذبہ پیدا ہوا ”اچھا تو مجھے جگالیا ہوتا۔“

”انہوں نے جگانے نہیں دیا۔ آج شام وہ تجھ سے ملیں گے۔“

”ٹھیک ہے چاچا۔ پر ابھی مجھے باہر جانا ہے۔“ الٹی بخش نے کہا ”ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“

کرم دین نے بے اعتباری سے اسے دیکھا ”دیکھ، تو ملے بغیر چلا گیا تو میری بڑی بے عزتی ہوگی۔“

”ارے چاچا، تم میرے لئے ابا جیسے ہو۔ میں تمہاری بے عزتی کر سکتا ہوں۔“ الٹی بخش نے مسکراتے ہوئے کہا ”وہ جن لوگوں

کے ساتھ میں رہتا ہوں، کل سے میرے لئے پریشان رہے ہوں۔
میں انہیں جا کر بتاؤں کہ میری فکر نہ کریں۔ میں خیریت سے ہوں۔“

”تو چلا جا۔ پر وہ ہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا ہے۔“ کرم دین نے کہا۔

الٹی بخش کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ رہنے والے کہاں کہاں کام کرتے ہیں۔ اس نے سوچا، جا کر ٹار کو بتا دے گا۔ کرامت اس کے پاس آتا رہتا ہے۔ ٹار اسے بتا دے گا۔

وہ فٹ پاتھ پر پہنچا تو پتا چلا کہ اس کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ سب پریشان تھے۔ کرامت بھی آیا ہوا تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ وہ تو گزشتہ روز دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے نکلا تھا اور اس کے بعد واپس ہی نہیں گیا تھا۔ وہ لوگ تو کل سے اس کے لئے پریشان تھے۔ اسے ڈھونڈتے بھی پھرے تھے۔ پھر ٹار نے اس کے برش اور پیٹ کے خالی ڈبے سامنے پان والے کی دکان پر رکھ دیے تھے۔

وہ سب الٹی بخش کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ الٹی بخش نے انہیں سب ماجرا سنایا۔ کرامت مطمئن ہو کر چلا گیا۔

”بات تو جب ہے کہ تجھے اس بنگلے میں نوکری مل جائے۔“ ٹار نے کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو ٹار بھائی۔“ الٹی بخش بولا ”میں یہ فٹ پاتھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔“

”بے وقوف نہیں تو۔ ابے یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ پگار کی بات ہی اور ہے۔ ایک تاریخ کو لگی بندھی رقم ہاتھ میں۔ یہاں کیا ہے ایک دن کام مل گیا تو چار دن چھٹی اور ایک دن فاقہ۔“

”نہیں ٹار بھائی۔ یہ فٹ پاتھ کی زندگی بڑی رو سینک ہے۔“ الٹی بخش نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا ”کسی کو یہ زندگی بڑی رو سینک لگتی ہے۔“

ٹار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ”تو کتابیں بہت زیادہ پڑھنے لگا ہے۔“ اس نے الٹی بخش پر آنکھیں نکالیں۔

وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر الٹی بخش بنگلے کی طرف چل دیا۔ وہاں کرم دین باغیچے میں کیا بیاں ٹھیک کر رہا تھا۔ اس نے اسے اپنے ہی پاس بلا لیا ”بتا آیا اپنے ساتھیوں کو؟“

”ہاں چاچا۔“

”دیکھ مجھے لگتا ہے کہ اب تو اس گھر سے نہیں جائے گا۔“

”کیا بات کرتے ہو چاچا۔“

”میرا اندازہ تو یہی ہے بیٹے۔“

اتنے میں سادی گیٹ سے اندر آئی۔ وہ کالج سے واپس آئی تھی اور کالج کی سفید یونیفارم میں بہت پاری لگ رہی تھی۔ انہیں بیٹھا دیکھ کر وہ ان کی طرف چلی آئی ”کیسے ہو الٹی بخش؟“ اس نے پوچھا ”تکلیف بڑھی تو نہیں؟“

الٹی بخش کو احساس ہوا کہ وہ اسے ٹھنکی باندھے دیکھ رہا ہے۔

اس نے گہرا کر نظریں جھکالیں ”میں بالکل ٹھیک ہوں بی بی۔ ابھی باہر بھی گیا تھا۔“

”بہت اچھی بات ہے۔ مجھے تمہاری بڑی فکر تھی۔“ سادی نے سادی سے کہا۔ پھر بولی ”میرا نام سعدیہ ہے۔ سب سادی کہتے ہیں مجھے۔“

”مجھے معلوم ہے بی بی۔“ الٹی بخش نے کہا۔ اسے اپنا دل ڈھول کی طرح جتنا محسوس ہو رہا تھا، جس کی آواز سب کو سنائی دے رہی ہو۔ کیسی بات تھی یہ۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے اس کی فکر ہے۔ وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ وہ سعدیہ یا سادی کہہ کر اسے پکارے۔ اے... کسی خوش فہمی میں جھٹا ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنے دل کو ٹوکا۔

”تو پھر ایسے ہی پکارا کرو مجھے۔“

الٹی بخش کہنا چاہتا تھا کہ وہ تو ایک ایسا بچہ ہی ہے جو سفر کے دوران تھک کر پل دوپل کے لئے اس شاخ پر بیٹھ گیا ہے اور اب اسے اڑ جانا ہے۔ یہاں یہ مسئلہ ہی کب ہے کہ اسے کیسے پکارا جائے لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

سادی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ صدر دروازے سے اسے امی نے آواز دے لی ”سعدیہ کالج سے آگئی ہو تم؟“

”جی امی، ابھی آئی ہوں۔“ سادی نے کہا اور الٹی بخش سے مزید کچھ کہے بغیر اس طرف چلی گئی۔

”سادی بی بی بہت اچھی ہیں۔“ کرم دین نے کہا۔

الٹی بخش نے اس پر بھی کچھ نہیں کہا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرم دین کے اس جیلے کو ہزار گنا بہتر بنانے والے لفظ بھی وضع کئے گئے ہیں؟ کیا یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ سادی بی بی کتنی اچھی ہیں؟



اس روز شیخ صاحب ساڑھے پانچ بجے گھر آگئے۔ ہاتھ روم سے آکے لباس تبدیل کر کے اور چائے پینے کے بعد تازہ دم ہو کے انہوں نے کرم کو بلوایا ”کرمو، اس الٹی بخش کو میرے پاس لے آؤ۔“ انہوں نے کہا ”ہاں۔۔۔ تم اسے یہاں چھوڑ کر چلے جانا۔“

”جی بہتر صاب جی۔“

شیخ صاحب اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کرمو الٹی بخش کو وہاں لے آیا۔ شیخ صاحب نے اٹھ کر بڑے تپاک سے الٹی بخش سے مصافحہ کیا ”آؤ بیٹے۔ یہاں بیٹھو میرے پاس۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

کرم دین نے پوچھا ”میں جاؤں صاب؟“

”ہاں، تم جاؤ۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ اور پھر الٹی بخش کی طرف متوجہ ہوئے ”تم بیٹھے نہیں ابھی تک۔“

الٹی بخش نے جھجکتے ہوئے کہا ”میں یہیں ٹھیک ہوں صاب۔“ وہ کمرے کی آرائش سے مرعوب ہو گیا تھا۔ ایسی آرائش تو اس فلیٹ کی بھی نہیں تھی جہاں وہ اس دن مزدوروں کی ٹولی کے ساتھ گیا تھا۔ جبکہ وہ بھی مرعوب کر دینے والی تھی۔

”نہیں بھئی، بیٹھ جاؤ آرام سے۔“ شیخ صاحب نے زور دے کر کہا ”دیکھو، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اللہ کسی کے ویلے سے احسان کرتا ہے تو اس ویلے کا احترام بھی ضروری ہے۔ اصل میں وہ احترام بھی اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔ اللہ نے تمہارے ذریعے میرے بیٹے کو اور کرم کو کو نئی زندگی دی۔ جواب میں میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں تھوڑی دیر عزت تو دے سکتا ہوں۔“ انہوں نے تھوڑی دیر پر خاص طور پر زور دیا۔

الہی بخش کی جھجک دور ہو گئی۔ اسے شیخ صاحب اچھے لگے۔ وہ مختلف انداز میں بات کر رہے تھے۔ انہوں نے رشتا بھی اس کے احسان پر زور دے کر اسے شرمندہ نہیں کیا تھا۔ وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھ گیا گیا۔ دھنسن گیا کئے۔ اور جتنی تیزی سے وہ دھنسا تھا وہ ڈر گیا لیکن پھر اسے آرام کا احساس ہونے لگا۔

”یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ شربت یا چائے؟“ شیخ صاحب نے پوچھا۔ ”کچھ... کچھ بھی نہیں صاب جی۔“ الہی بخش نے گڑبڑا کر کہا۔ ”دیکھو الہی بخش، تم بات سمجھ نہیں رہے ہو۔“ شیخ صاحب نے ناصحانہ انداز میں کہا ”تم اس وقت میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں بیٹھے ہو۔ اور مہمان میزبان سے برتر ہوتا ہے۔ تم جہاں کے ہو وہاں تو مہمان نوازی ہمارے ہاں سے بڑھ کر کی جاتی ہے اور یہ اللہ کا حکم بھی ہے۔ یہ ذہن میں رکھو کہ تم میرے مہمان ہو، ملازم نہیں۔“

اس بار انہوں نے ملازم پر بطور خاص زور دیا ”اب بولو کیا پیو گے؟“

”چائے پی لوں گا صاب جی۔“ شیخ صاحب نے جیلہ کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا۔ پھر الہی بخش سے بولے ”یہ صاب جی کیا ہوتا ہے۔ میرا نام شیخ مظہر علی ہے۔ صاب جی تو بس میرے گھر کے ملازم ہی کہتے ہیں مجھے۔“

الہی بخش کے کانوں میں سادی کی آواز گونجی... میرا نام سعد یہ ہے۔ سب لوگ سادی کہتے ہیں مجھے۔

جیلہ چائے لے آئی۔ الہی بخش جلد از جلد پیالی خالی کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا ”اب تم کیسے ہو؟“ شیخ صاحب نے پوچھا۔

”جی؟“ سادی کے تصور میں الجھے ہوئے الہی بخش کی سمجھ میں پہلے تو بات ہی نہیں آئی۔ پھر اس نے کہا ”اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اب میں جانا چاہتا ہوں۔“

”میں تو چاہتا تھا کہ تم ہمیں چند روز میزبانی کا موقع دو۔ لیکن زبردستی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے تمہارے کام کا حرج ہو رہا ہو۔ ٹھیک ہے، تم آج ہی چلے جانا لیکن پہلے کچھ دیر اپنے بارے میں باتیں کرو مجھ سے۔“

الہی بخش یک لخت پُرسکون ہو گیا۔ شیخ صاحب عجیب آدمی تھے۔ رکی باتوں کا سرسری تذکرہ کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر

بندھے ہوئے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شیخ صاحب اس سے اس کے بارے میں پوچھتے رہے۔ اس کے ماں باپ، گھر بار، تعلیم، کام... انہوں نے سبھی کچھ پوچھ ڈالا۔

تھوڑی دیر بعد الہی بخش نے کہا ”سر... اب مجھے اجازت دیجئے۔“

”ہاں... ٹھیک ہے۔“ شیخ صاحب نے اٹھ کر اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا ”دیکھو میاں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے تو تمہیں فرشتہ رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن میں ہر وقت احسان کی رٹ لگانے کا قائل نہیں۔ ہاں ایک بات پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں۔ اس گھر کو ہمیشہ اپنا ہی گھر سمجھنا۔ جب ملنے کوئی چاہے، چلے آتا۔ کبھی کسی وقت... کل یا دس بیس سال بعد میں تمہارے کسی کام آسکوں تو اپنا بزرگ سمجھ کر بلا تکلف میرے پاس چلے آتا۔ میں انشاء اللہ تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

الہی بخش کو اپنا دل کھلتا محسوس ہوا۔ کیسے اچھے آدمی ہیں یہ شیخ صاحب۔ احسان احسان کر کے اسے شرمندہ بھی نہیں کیا اور اتنا کچھ کہہ بھی دیا۔ انہیں عزت دینا اور عزت کرانا آتا ہے۔ ”شکریہ سر، میں یاد رکھوں گا۔“

الہی بخش دروازے پر پہنچا تھا کہ شیخ صاحب کی آواز پر اس کے قدم ٹھک گئے ”الہی بخش، ذرا سنو تو۔“

اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا ”جی سر۔“ ”یہاں آؤ، پانچ منٹ اور بیٹھو۔“

الہی بخش جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”بھئی معاف کرنا۔ میں نے تمہاری بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔ تم پینٹر ہونا؟“

الہی بخش نے اثبات میں سر ہلایا ”جی سر۔“ ”جو کچھ میں نے تم سے کہا، وہ اپنی جگہ۔ میں اپنی بات مکمل بھی کر چکا ہوں۔ مجھے اچانک خیال آیا ہے کہ ایک کاروباری بات تم سے کر لی جائے۔“

”کاروباری بات؟ اور مجھ سے؟“ الہی بخش نے حیرت سے سوچا۔ ”میں چھ مہینے سے سوچ رہا ہوں کہ پورے گھر کو دوبارہ پینٹ کرانا ہے۔“ شیخ صاحب کہہ رہے تھے ”اب تم نعمت کی طرح آگئے ہو تو کیوں نہ تم سے کچھ فائدہ ہی اٹھالوں۔“

الہی بخش شیخ صاحب کی فہم و فراست کا قائل ہو گیا۔ اصولاً اسے جواب میں کہنا چاہئے تھا کہ جو کچھ میں نے کیا، وہ خدا کی مرضی کے تحت سرزد ہوا۔ انہیں احسان سمجھ کر اس کا صلہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جس نے ابتدا میں ہی کہہ دیا تھا کہ احسان اللہ کا ہے۔ البتہ ویلے کی حیثیت سے اس کا احترام کیا جا رہا ہے اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ پینٹر ہے تو وہ اس سے فائدہ ہی نہ اٹھالے۔ ایسے شخص سے ایسی بات کیسے کی جاسکتی ہے۔

”ذرا اس ذرا تنگ روم کی دیواریں دیکھو اور انصاف سے کہو

”ٹھیک ہے الہی بخش۔ میں انتظار کر لوں گا۔“

○☆☆○

بارہ دن بعد پورا بنگالیوں جگمگا رہا تھا، جیسے ابھی تعمیر ہوا ہو۔ الہی بخش نے اپنے رنگوں کے انتخاب سے ثابت کر دیا تھا کہ رنگ ساز بھی فنکار ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب بہت خوش تھے۔ الہی بخش ان کی آزمائش پر پورا اترا تھا۔ اس نے ان کے اندازے کی تائید کر دی تھی۔

شیخ صاحب میں انسان کو ایک نظر میں پہچان لینے کی قدرتی صلاحیت تھی۔ لیکن انہوں نے اس پہلی نظر کے فیصلے پر کبھی اعتبار نہیں کیا تھا۔ اعتبار وہ آزمائش کے بغیر کبھی نہیں کرتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ الہی بخش آزمائش سے گزرنے کے درمیان ہی قابل اعتبار ثابت ہو گیا تھا۔

بظاہر شیخ صاحب نے کرم دین کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی لیکن درحقیقت انہوں نے اسے الہی بخش کی آزمائش سے مشروط کر دیا تھا۔ بجٹ کے رنگ و روغن کا ٹھیکہ ہی اس کی آزمائش تھا۔ الہی بخش کام شروع کر چکا تھا۔ ایک دن شیخ صاحب نے اپنے ایک دوست سے جو قریب ہی رہتے تھے، اس سلسلے میں بات کی ”یار وکیل صاحب، یہاں اچھا رنگ و روغن کرنے والے ہی نہیں ملتے“ انہوں نے کہا۔

یہ وہی وکیل صاحب تھے جن کے ہاں الہی بخش دوبار کام کر چکا تھا۔ ”بات تو سچ ہے شیخ صاحب۔ لیکن مجھے قسمت سے مت اچھا کارگیر مل گیا تھا۔ وہ کینے لبرٹی کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہے الہی بخش نام ہے اس کا۔“

شیخ صاحب نے اپنے تاثرات کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔ ”بھائی قسمت سے اچھا کارگیر مل جائے تو وہ ویسے کمال کھینچ لیتا ہے۔ دہاڑی پر کام کراؤ تو کام لبا کر دیتے ہیں۔ ٹھیکے پر دو تو حساب میں گھپلا کر دیتے ہیں۔“

”الہی بخش کا یہی تو کمال ہے۔“ وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ”اتنا ایماندار آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ٹھیکے پر کام کرنے والا مزدور جتنا کام ڈیڑھ دن میں کرتا ہے، الہی بخش ایک دن کی دہاڑی میں کرتا ہے۔“

”یقین نہیں آتا۔“

”میں خود دوبار اس سے کام کرا چکا ہوں۔“

اس کے بعد شیخ صاحب نے خود مشاہدہ کیا۔ الہی بخش صبح نو بجے کام شروع کرتا تھا۔ چھ بجے وہ کام روک دیتا تھا۔ یہ معمول کے مطابق تھا۔ لیکن اس کے کام کی رفتار بہت تیز تھی اور اس کے کام میں غیر معمولی بلکہ فنکارانہ صفائی تھی۔

بارہویں دن وہ دونوں آنے سائے بیٹھے تھے۔ الہی بخش شیخ صاحب کو حساب دے رہا تھا ”پینٹ کے ڈبے کی یہ قیمت تو نہیں۔“ شیخ صاحب نے اعتراض کیا۔

الہی بخش کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی ”اس سے کم قیمت

کہ یہ موجودہ پینٹ کیا اس کے شاپان شان ہے۔ رنگ و روغن ہونے کے بعد یہ کیسا لگے گا؟“ شیخ صاحب نے جیسے اس کے خیالات بڑھ گئے۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنی فہم و فراست کا ثبوت دیا تھا۔

الہی بخش نے ڈرائنگ روم کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ شیخ صاحب کی شرط تھی کہ اسے جواب انصاف سے دینا ہے۔ وہ ٹال نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے انصاف سے کہا۔

”آپ درست فرماتے ہیں سر۔ دیواروں کو واقعی تازہ پینٹ کی ضرورت ہے۔“

”تو چلو، میں تمہیں پورا گھر دکھا دوں۔“

الہی بخش نے گھر دیکھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے سادی کا کمرہ بھی دیکھ لیا۔ کمرے کی سادگی اور خوب صورتی نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس نے بڑی چاہت سے کمرے کا چپہ چپہ دیکھا، جیسے وہ زیارت کے قابل کوئی حبرک مقام ہو۔

شیخ صاحب اسے پھر نیچے لے آئے ”اب اپنی اجرت بتاؤ۔“ وہ بولے۔ الہی بخش جھپکایا تو انہوں نے کہا ”دیکھو! یہ کاروباری بات ہے۔ ہمارے تعلقات سے الگ۔“ انہوں نے تعلقات پر زور دیتے ہوئے کہا ”اس میں نہ شراؤ۔ نہ میں تمہیں اجرت زیادہ دوں گا نہ کہ جو جتنی ہے وہ لو گے۔“

”آپ کام ٹھیکے پر دیں گے یا دہاڑی پر کرائیں گے؟“ الہی بخش رنگ ساز الہی بخش بن گیا۔

”دہاڑی پر“ شیخ صاحب نے بلا جھجک کہا۔

”دہاڑی پچیس روپے روز ہوگی۔ میٹرل آپ کا۔“

شیخ صاحب نے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیے ”یہ ہزار روپے ہیں۔ پینٹ اور دوسری چیزیں تمہی لاؤ گے۔ آخر میں حساب دے دینا۔ اور ضرورت پڑے تو بیگم صاحبہ سے لیتا۔“

”کلر آپ پسند کر لیں سر۔ میں کارڈ لا کر دکھاتا ہوں آپ کو۔“ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو رنگوں کی تمیز نہیں۔ تم خود رنگ پسند کر لیتا۔ میں اسے رنگ کرنے والے کی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ پچھلی بار بھی یہ کام میں نے پینٹر کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر اس نے مجھے مایوس کیا۔ امید ہے تم مجھے خوش کر دو گے۔“

”ذمہ داری بہت بڑی ہے سر۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو خوش کر دوں گا۔“ الہی بخش نے اعتماد سے کہا۔

”بس تو جاؤ۔ اور کل سے کام شروع کر دو۔“

الہی بخش جانے لگا تو شیخ صاحب نے اسے آواز دی ”سنو اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے اپنے پیشانی کے اس زخم کے بارے میں بتاؤ۔“

الہی بخش سوچ میں پڑ گیا۔ کیا بتائے اس زخم کے بارے میں۔ اسے تمذیبات کے بے نشان عشق۔ ”آپ کا کام پورا کرنے کے بعد تالیاں گا سر۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا ”بشرطیکہ آپ اکر دقت بھی جاننا چاہیں۔“

میں مجھے تو نہیں مل سکتا سر۔“

شیخ صاحب اعتماد سے مسکرائے انہوں نے اپنا ہوم ورک بتا اچھی طرح کیا تھا ”میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”میری معلومات کے مطابق ڈبا ایک سو دس روپے کا ملتا ہے۔ تم نے اٹھانوے روپے کا کیسے لے لیا؟“

اب کے الٹی بخش بھی مسکرایا ”دکان والے مجھے جانتے ہیں۔ میں ہمیشہ وہیں سے لیتا ہوں۔ وہ مجھے کنیشن دیتے ہیں۔“

شیخ صاحب بہت خوش ہوئے۔ عام طور پر کارمگر زیادہ رقم کی رسید بنواتے تھے اور پیسہ بچاتے تھے۔ انہوں نے حساب لگایا تو پتا چلا کہ الٹی بخش نے ان کو کم از کم ڈیڑھ سو روپے کی بچت کرائی ہے۔ انہوں نے اسے اس کی اجرت دی۔ سو روپے انعام کے طور پر دیے۔ پھر بولے ”دیکھو الٹی بخش، میں بزنس میں ہوں۔ نقصان کا سودا کبھی نہیں کرتا۔ ایمان دار آدمی کو اپنا پانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اس میں بھی میرا اپنا ہی فائدہ ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے کام کرو۔“

الٹی بخش ہنسنے لگا ”رنگ و روغن کا کام کرنے والے کو ملازم رکھ کر آپ کو کیا فائدہ ہوگا سر؟“

”میں تمہیں اس حیثیت میں ملازمت کی پیشکش تو نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟“

”جی سر۔“

”تو بس میں تمہیں ڈرائیور رکھنا چاہتا ہوں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ سہیہ کے لئے گاڑی انہوں نے دو دن پہلے خرید لی تھی۔

”مجھ پر تو یہ احسان ہوگا سر۔“

”مگر فائدہ زیادہ مجھے ہوگا۔ خیر۔۔۔ میں تمہیں نو سو روپے تنخواہ دوں گا۔ رہنے کے لئے کوارٹر، کھانا گھر سے ہی ملے گا۔ تم صرف سہیہ کی گاڑی ڈرائیو کرو گے۔ بولو منظور ہے۔“

الٹی بخش کیا بولتا۔ وہ تو ہنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اور سادی کی گاڑی! وہ اسے ہر جگہ لے جایا اور لایا کرے گا۔ اتنی قوت۔۔۔ اتنا ہذا اعزاز!

یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ یہ قسمت میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ کہاں پہنچا دیا ہے مجھے؟ اور کہاں تک لے جایا جائے گا؟ مگر پھر اسے خیال آیا کہ وہ ناشکراہن کر رہا ہے۔ اسے تو اس کی توقع سے بہت زیادہ مل رہا ہے۔

اس کی خاموشی سے شیخ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسے تنخواہ پر اعتراض ہے ”دیکھو میاں، پچیس روپے روز کے حساب سے تمہیں مہینہ بھر بھی کام ملے تو ساڑھے سات سو روپے ملیں گے۔ میں تمہیں نو سو دے رہا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں سر۔ یہ تنخواہ تو میری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔“

”بس تو ٹھیک ہے۔ کل مجھے ٹرائی دے دو اور کام شروع کرو۔“

”تھینک یو سر۔“

”جاؤ۔ کرو تمہیں تمہارا کو آرڈر دکھا دے گا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔“

الٹی بخش اٹھنے لگا تو شیخ صاحب نے کہا ”ڈرا ٹھہرو۔ تمہیں یاد ہے، تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا؟“

”سر۔۔۔ مجھے یاد نہیں۔“

”میں یاد دلاتا ہوں۔ وہ وعدہ تمہارے پیشانی کے زخم کے متعلق تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ الٹی بخش ہچکچایا۔

”بتانا نہیں چاہتے تو میں زور نہیں دوں گا۔“

”نہیں سر۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ایسا وعدہ کبھی نہیں کرتا جو پورا نہ کر سکوں۔ مگر آپ کا وقت ضائع ہوگا۔“

”تم سناؤ۔“

”یہ ایمان داری کا صلہ ہے یا عشق کا حاصل، آپ خود ہی سن کر فیصلہ کر لیجئے گا۔“ الٹی بخش نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ برسوں پہچے چلا گیا۔ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔۔۔۔۔



ان دنوں الٹی بخش فوجیوں کی بھرکس میں رنگ و روغن کا کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی کارمگر تھے۔ وہ سبھی اس سے شاکی تھے۔ جبکہ فوجی خوش رہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک مثالی مزدور تھا۔ اس متضاد رویے کی وجہ مشترک تھی۔

الٹی بخش کم ٹخن اور کم آمیز تھا۔ کام کے وقت میں وہ صرف کام کرتا تھا۔ یہ سب کبھی چائے پینے میں لگ گیا یا کبھی سگریٹ سلگالی۔ وہ دوسرے مزدوروں کی طرح شپ میں بھی نہیں لگتا تھا۔ پھر اس کی کام کی رفتار بھی اپنے ساتھیوں سے زیادہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دوسروں سے دگنا کام کرتا تھا۔ اس بنا پر فوجی اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ دوسرے مزدوروں کو لعن طعن کرتے تھے کہ وہ الٹی بخش کی طرح کام کیوں نہیں کرتے۔ کئی بار مزدوروں کو تنبیہ بھی کی جا چکی تھی کہ انہوں نے اپنی کارکردگی نہیں بڑھائی تو انہیں نکال دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس پر ساتھی کارمگر اس سے خفا تھے۔

ایک دن کھانے کے وقفے میں ساتھیوں نے اسے گھیر لیا ”او بھائی الٹی بخش، تو اتنا کام کیوں کرتا ہے؟“ ایک نے پوچھا۔

یہ سوال ہی الٹی بخش کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے کہا ”تو کیا کام نہ کیا کروں؟“

”کام کر، لیکن ہماری طرح۔ ہم بھی تو کام کرتے ہیں۔“

”بھائی، تمہاری میری رفتار میں فرق ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”تمہارے لئے اتنی سی بات ہے۔“ ایک اور کارمگر بولا ”لیکن اس کی وجہ سے ہم پر تو مصیبت آتی رہتی ہے۔“

”جس کا کون؟“ الہی بخش نے بے بسی سے کہا۔

”نی رفتار کو ہمارے برابر لے آ۔“ تیسرے نے مشورہ دیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ الہی بخش نے حیرت سے پوچھا۔

”ہووار“ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ”پہلے نے جھنجھلا کر کہا“ تھوڑی تھوڑی دیر میں گپ شپ کر لیا کر کسی سے۔“

”مجھے گپ شپ کرنے کے نہیں کام کرنے کے ملتے

نبہ۔“ ہمیں بھی مظلوم ہے۔ پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“

”تمہیں نہیں پڑتا ہوگا۔“ الہی بخش نے درشت لہجے میں کہا۔

میں حلال کی کھانا چاہتا ہوں۔“

”تو کیا ہم حرام کی کھاتے ہیں؟“ ایک کاریگر آپے سے باہر ہونے لگا۔

”یہ مجھے نہیں معلوم نہ مجھے اس کی فکر ہے۔“ الہی بخش نے

باپ کا سمجھایا ہوا دہرایا ”میں صرف اپنی فکر کرتا ہوں۔“

”دیکھ بھائی“ مان جا۔“ ایک اور کاریگر نے بڑے تحمل سے کہا۔

”تمہی وجہ سے ہم ذلیل ہوتے ہیں۔ ہماری روزی کھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔“

”کیا میں تمہاری وجہ سے اپنی عاقبت خراب کر لوں؟“ الہی

بخش نے کڑے لہجے میں کہا ”یہ نہیں ہو سکتا۔“

سب کاریگر اپنا سامنہ لے کر رہ گئے ”دیکھو الہی بخش“ دیر میں

وہ کر مگر مجھ سے دلخشی نہیں لیتے۔“ ایک جو شیلے مزدور نے تینیا

کہا۔

”بات سنو۔ میں انچارج صاحب کو سمجھا دوں گا کہ میری اور

تمہاری رفتار میں فرق ہے۔ اسے مسئلہ نہ بنائیں ورنہ میں کام ہی

چھوڑ دوں گا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے میرے باپ

نے ہمیشہ رزق حلال کمانے کی تاکید کی ہے۔“

اس پر بھی کاریگر بوکھلا گئے۔ جانتے تھے کہ انچارج سمجھ

جائے گا کہ وہ لوگ الہی بخش کو تنگ کر رہے ہیں۔ اور وہ الہی بخش کو

کام بھی نہیں چھوڑنے دے گا چاہے باقی سب کی چھٹی کرا دے۔

”نہیں بھی الہی بخش۔ تجھے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ پہلے

نے کہا۔

”اچھا ہو تاکہ تو ہماری بات مان لیتا۔“ ایک اور بولا۔

”چلو“ میں کام ہی چھوڑ دیتا ہوں۔“ الہی بخش نے بے بسی سے

کہا ”اللہ رزق دینے والا ہے۔“

”یہ غلطی بھی نہ کرتا۔“ تیسرا بولا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ

انچارج کو پتا چل جائے گا کہ ان لوگوں نے الہی بخش پر دباؤ ڈالا

ہے۔ پھر ان کا روزگار بھی جائے گا اور وہ بلیک لسٹ بھی ہو جائیں

گے ”ٹھیک ہے یا۔ جوئی چاہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے۔“

بات آئی گئی ہو گئی۔ تین چار دن بعد انچارج نے ایک کاریگر

کی چھٹی کرا دی۔ اسے شکایت تھی کہ وہ پورا کام نہیں کر رہا ہے۔

”سب لوگ سدھر جاؤ۔“ اس نے دیگر کاریگروں سے کہا ”دیکھو

الہی بخش بھی تو کام کرتا ہے۔“

”سرتی“ آپ مجھے سچ میں نہ لائیں۔“ الہی بخش نے انچارج

سے بڑی عاجزی سے کہا ”مجھے اللہ نے زیادہ رفتار دی ہے تو اس میں

ان لوگوں کا تو قصور نہیں۔ یہ اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتے

ہیں اور میں اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہوں۔“

”بات اللہ کی دی ہوئی رفتار کی نہیں۔“ انچارج نے کڑے

لہجے میں کہا ”یہ حرام خور ہیں۔ جان بوجھ کر کم کام کرتے ہیں۔“

”سرتی“ پھر میں کام چھوڑ دیتا ہوں۔“

”کام چھوڑ کر تو دیکھو۔ گھر سے اٹھو لوں گا تجھے۔“

اگلے روز کاریگر بہت پریشان تھے۔ ان کا ایک ساتھی نکالا

جا چکا تھا۔ اوروں کی باری بھی آ سکتی تھی۔ وہ تیز ہاتھ چلانے کی

کوشش کر رہے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ انہیں اس کی عادت نہیں

تھی۔ انہوں نے الہی بخش سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ ان کے خیال

میں وہ بدرنگ تھا۔

ان میں ایک سید کاریگر بھی تھا۔ اس کا نام سلیمان شاہ تھا۔

وہ بھی کم آمیز تھا۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ اس روز سب

کھانے کے لئے نکلے تو انہوں نے سلیمان شاہ کو پکڑ لیا ”دیکھا شاہ

جی“ یہ الہی بخش کیا کر رہا ہے ہمارے ساتھ۔“ لال خان نے بات

شروع کی۔

”کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟“ سلیمان شاہ نے پوچھا۔

”کل اصغر کی چھٹی کرا دی اس نے۔“

”اچھا مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔“ سلیمان شاہ مگزشہ روز کام

پر نہیں آیا تھا ”ہوا کیا؟“

”وہی شکایت شاہ جی کہ ہم لوگ کام چوری کرتے ہیں۔“

”تو اس سے الہی بخش کا کیا تعلق؟“

”سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔“ لال خان نے کہا۔ اس

وقت وہی سب کی نمائندگی کر رہا تھا ”وہی اپنی ایمان داری کا چرچا

کرتا رہتا ہے۔ باقی سب تو حرام خور ہیں۔“

”سب ہوں گے۔ میں نہیں ہوں۔“ سلیمان شاہ نے اکر کر

کہا۔ اور یہ سچ تھا۔ سلیمان شاہ بھی اکل حلال کا قائل تھا۔

”گستاخی معاف شاہ جی۔“ شکور بولا ”الہی بخش کے سامنے تو

بھی حرام خور ہیں۔ ہم دن میں ایک دیوار کرتے ہیں۔ آپ ڈیڑھ

کرتے ہیں اور الہی بخش دو دیواریں نسا دیتا ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ میں حرام خوری تو نہیں کرتا۔ الہی بخش کا ہاتھ تیز

چلتا ہے اس لئے وہ زیادہ کام کر لیتا ہے۔“

”ہاتھ تیز نہیں چلتا شاہ جی۔ وہ ہمیں ذلیل کرنے کے لئے تیز

ہاتھ چلاتا ہے۔“ لال خان بولا ”ہمارا تو کچھ نہیں۔ پر شاہ جی“ آپ

تو عزت والے لوگ ہو۔ الہی بخش کو سمجھاؤ نا۔“

”الہی بخش تو صاف کہتا ہے کہ اس کے سوا سب بے ایمان

اور حرام خور ہیں۔“ شکور نے آگ لگانے کی کوشش کی۔

سلیمان شاہ آگ بگولا ہو گیا ”کس کی مجال ہے کہ میرے

بارے میں ایسی بات کہے۔

”زبان سے کتنا ضروری تو نہیں ہوتا شاہ جی۔“ یار محمد نے کہا۔
”حقاً بخش اپنے عمل سے یہی کہہ رہا ہے۔“
”مرد کسی دن انچارج صاحب بھی کہہ دیں گے۔“ لال خان

بولے۔

”چھا اب بس کرو۔ مجھے کھانا کھانے دو۔“ سلیمان شاہ
فرمایا۔ لیکن اس سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ بے ایمانی اور حرام خوری
کا لہذا اس کے لئے بہت بڑا تھا۔

الہی بخش کو ان سب باتوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ اس شام کام
سے فارغ ہو کر بازار چلا گیا۔ بازار میں بھی زیادہ دیر نہیں گئی۔
امید تھی کہ مغرب سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے گا۔ پھینکی دھوپ میں وہ
ٹاڑی کے کچے راستے پر تیز قدم بڑھاتا چل رہا تھا کہ دائیں جانب
کے کھیتوں کی طرف سے اچانک ہی سلیمان شاہ اس کے سامنے
آکر ٹہرا ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبرنا تھی اور ہاتھ میں کھلاڑی۔

الہی بخش نے چونک کر اسے دیکھا اور احتراماً رُک گیا۔ سلیمان
شاہ کی وہ بہت عزت کرتا تھا۔ اس لئے کہ سلیمان شاہ خود بھی بہت
محنتی اور ایمان دار آدمی تھا۔ اس میں غرور بھی نہیں تھا جس سے
سادات عام طور پر مالا مال ہوتے ہیں ”سلام علیکم شاہ جی۔“ الہی
بخش نے کہا۔

سلیمان شاہ نے روکے لہجے میں سلام کا جواب دیا۔ پھر بولا۔
”الہی بخش، تجھ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔ اس لئے یہاں
تیرے انتظار میں کھڑا ہوں۔“

”مجھے گھر سے بلوایا ہوتا شاہ جی۔“ الہی بخش بولا ”خیر۔ حکم
کریں کیا بات ہے۔“

”پہلے تو ایک بات پوچھنی ہے تجھ سے۔ یہ بتا، تیرے خیال
میں بے ایمان اور حرام خور ہوں۔ کام چوری کرتا ہوں۔“
”توبہ شاہ جی توبہ۔“ الہی بخش نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے
کہا ”آپ کی ایمان داری تو مثالی ہے۔“

سلیمان شاہ کچھ نرم پڑ گیا ”تو چاہتا ہے کہ دوسرے مجھے بے
ایمان اور حرام خور سمجھیں؟“

”کیسی بات کرتے ہیں شاہ صاحب۔ میں بہت گناہ گار ہوں
لیکن اپنے گناہ کھانے والا آدمی نہیں۔“

”تو پھر تو مجھ سے زیادہ کام کیوں کرتا ہے؟“ سلیمان شاہ نے
کڑے لہجے میں کہا۔

”دیکھیں شاہ جی، مقررہ وقت میں آپ بھی ایمان داری سے کام
کرتے ہیں اور میں بھی۔ کام کی مقدار سے اس کا کیا تعلق؟“

”الہی بخش تو بس میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔“
”شاہ جی، آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ الہی بخش

نے بے حد رمان سے کہا ”دیکھیں، دوسرے لوگ آپ سے بھی کم
کام کرتے ہیں۔ اگر وہ آپ سے مطالبہ کریں کہ انہیں بے ایمانی
کے الزام سے بچانے کے لئے آپ اپنی استعداد سے کم کام کریں تو

آپ کیا کریں گے؟“

”کس کی مجال ہے کہ مجھ سے یہ بات کرے۔“ سلیمان شاہ کو
جلال آگیا۔

”بات مجال کی نہیں ہے، آپ صرف فرض کر لیں۔“
”دیکھ الہی بخش، میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ اب تو مجھ سے

زیادہ کام نہیں کرے گا۔“
”شاہ جی سرکار، یہ حکم مانوں گا تو میں بے ایمان نہیں ہو جاؤں

گا۔ میرے حلال رزق میں حرام نہیں مل جائے گا۔ شاہ جی سرکار،
اللہ کا حکم تو سب سے بڑا ہے۔“

”میں کچھ سنتا نہیں چاہتا۔“ سلیمان شاہ نے گرج کر کہا ”تجھے
میری بات ماننا ہوگی ورنہ۔۔۔“ اس نے کھلاڑی بلند کر لی۔

”دیکھیں شاہ جی، آپ اپنی ذمہ داری کا بھی خیال کریں۔“
الہی بخش نے عاجزی سے کہا ”میں تو آپ کے سامنے اپنے بچاؤ کے

لئے بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے کہ میرے باپ نے مجھے یہی
سکھایا ہے۔ تو میرا بچاؤ بھی آپ ہی کے ذمہ داری ہے اور آپ

آل رسول ہیں۔ آپ مجھے بے ایمانی اور حرام خوری کے لئے کیسے
کہہ سکتے ہیں۔“

لیکن مشتعل سلیمان شاہ اب کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں
تھا ”میں تیرا لیکچر نہیں سنوں گا الہی بخش۔“ اس نے کہا ”مجھے ہاں

یا نہ میں جواب دے۔“
”مجھے موت کا خوف نہیں ہے شاہ جی۔“ اب الہی بخش کا لہجہ

بھی سخت ہو گیا ”اللہ جانتا ہے کہ میں آپ کو زیادتی سے روکنے کی
طاقت بھی رکھتا ہوں۔ لیکن بزرگوں کی روایات اور لحاظ کا تقاضا

ہے کہ میں کچھ نہ کروں۔“
”جواب دے، ہاں یا نہ۔“

”جواب آپ کو معلوم ہے۔ میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں
گا۔“

سلیمان شاہ کا کھلاڑی والا ہاتھ نیچے آ رہا تھا۔ الہی بخش نے سر
اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کے جی میں آئی کہ ہاتھ بڑھا کر

کھلاڑی کو پکڑ لے۔۔۔ اور وہ ایسا کر بھی سکتا تھا۔ مگر اس کے اندر
ایسی کوئی تحریک نہیں تھی۔ وہ سر جھکانے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ

کھلاڑی اس کے چہرے پر نہیں لگی۔ البتہ اس کی پیشانی میں آکراتر
گئی۔

سلیمان شاہ نے فوارے کی شکل میں اگلے خون کو دیکھا تو اس
کا حوصلہ جواب دے گیا۔ غصہ سرد ہو گیا۔ اب اسے صرف یہ

خیال تھا کہ وہ بہت خطرناک حرکت کر بیٹھا ہے اور نجانے اس کا
انجام کیا ہو گا۔

الہی بخش پکراتا ہوا نیچے بیٹھتا گیا۔ اس کا ایک ہاتھ سختی سے
اپنی پیشانی پر جاتا تھا، جیسے خون روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر خون

کماں رکتا ہے۔ گاڑھا گاڑھا خون اس کی ہینچی ہوئی انگلیوں کے
درمیان سے بھی رس رہا تھا۔ سلیمان شاہ نے جو خون کا فوارہ

پہنچنے دیکھا تو اس کے اوسان جواب دے گئے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ تو بہت سی سنگین حرکت کر بیٹھا ہے۔ اضطراری طور پر وہ ہلکا اور ہلکا کھڑا ہوا۔

جانے وہ چند لمحے تھے یا کئی گھنٹے۔ بہر حال الٹی بخش وہیں بڑا ہلکا ہوا۔ پھر اسے قدموں کی آٹھیں سنائی دیں ”ارے۔۔۔ یہ تو بہت زخمی ہے۔“ کسی نے کہا۔ الٹی بخش کو وہ آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ کسی نے اسے سہارا دے کر بٹھایا ”خون رکنا تو مشکل ہے۔“ اسی آواز نے کہا ”چادر کس کر باندھ دیتا ہوں۔ آگے اللہ کی رحمت۔“

اس کے سر پر چادر کس کر باندھ دی گئی ”بخشے۔۔۔ تو چل سکتا ہے؟“ اس بار دوسری آواز نے پوچھا۔

الٹی بخش اثبات میں سر ہلا رہا تھا کہ پہلی آواز نے دوسری آواز کو ڈانٹ دیا ”کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔“

انہوں نے الٹی بخش کو اٹھایا۔ اسی دوران الٹی بخش کے ہوش حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے کس طرح لے کر گئے۔ ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا ”یہ پولیس کیس ہے۔“ ڈاکٹر کہہ رہا تھا ”پہلے تھانے لے کر جاؤ۔ رپورٹ رج کراؤ۔ پھر بتی ہوگی۔“

”چاہے اس دوران یہ مرجائے۔“ پہلی آواز نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ چاہے یہ مرجائے“ قانون تو قانون ہے۔“ ”عجیب قانون ہے۔ سزا مارنے والے کو ملنی چاہئے۔ یہاں سزا اسے مل رہی ہے جس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ آپ کے اس قانون سے ظالم کا کیا مجزے گا۔ ہاں مظلوم بچ بھی سکتا ہو تو بھی مرجائے گا۔“

”قانون میں نے نہیں بنایا۔“ ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا ”میں اس کے خلاف کروں گا تو مصیبت میں پھنسوں گا۔“ ”اور یہ مر گیا تو آپ کے ضمیر پر بوجھ نہیں ہوگا۔“

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے الٹی بخش کی پیشانی پر بندھا ہوا صاف کھول کر زخم کا معائنہ کیا اور نرم پڑ گیا۔ خون پہلے ہی بہت نالغ ہو چکا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے۔ میں مریض کی پٹی کرتا ہوں۔ تم ایک کام کرو۔ تھانہ یہاں قریب ہی ہے۔ ایس ایچ او شاہ صاحب میرے دوست ہیں۔ ان سے جا کر کہو کہ میں نے انہیں بلایا ہے۔ میرا نام ڈاکٹر جمیل ہے۔“ فاضل تھانے چلا گیا۔ ڈاکٹر الٹی بخش کے لئے مصروف ہو گیا۔



چند گھنٹے بعد الٹی بخش تھانے میں ایس ایچ او ابرار شاہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اسے اسپتال میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ زخم گہرا ضرور ہے لیکن خطرناک ہرگز نہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ زخم ملک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ داغ پر

بھی اثر پڑ سکتا تھا۔ بینائی، سماعت یا قوتِ شامہ بھی ختم ہو سکتی تھی لیکن ایسا ہوا نہیں ہے۔ البتہ زخم کے معاملے میں احتیاط کرنا ہوگی اور اپنی باقاعدگی سے کرانا ہوگی۔

”اب کیا محسوس کر رہے ہو؟“ ایس ایچ او نے مشتاقانہ لہجے میں الٹی بخش سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں شاہ جی سرکار۔ بس ذرا کمزوری ہے۔ جگر آتے ہیں۔“ الٹی بخش نے جواب دیا۔

”ابھی تمہاری دوائیں آجائیں گی۔ یہ بتاؤ بات کر سکتے ہو مجھ سے؟“

”جی شاہ صاحب۔“

ابرار شاہ نے پیڑ ساٹنے کھینٹا اور پنسل سنبھال لی ”تمہیں کس نے مارا ہے؟“

”سلیمان شاہ نے۔“

ابرار شاہ چونکا۔ سلیمان شاہ اس کا دور کارشتے دار ہوتا تھا۔ سوال کر کے اس نے اس بات کی تصدیق بھی کر لی ”ہوا کیا تھا؟“

الٹی بخش نے پوری تفصیل بتادی۔ ابرار شاہ متاسفانہ انداز میں سر ہلاتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”انصاف چاہتا ہوں شاہ جی سرکار۔“

ابرار شاہ نے سر کو تھیمی جنبش دی ”تمہیں انصاف ملے گا۔ بے فکر رہو۔“ پھر اس نے آواز لگائی ”میرا م خان۔۔۔ تین کانٹیل ادر بھیج دو۔“

چند لمحے بعد تین کانٹیل اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ”درو۔۔۔ تم تینوں جاؤ اور سلیمان شاہ کو پکڑ لاؤ۔ ہتھکڑی لگا کر لانا اسے۔ رعایت کوئی نہیں کرنی۔“ یہ کہہ کر وہ ان تینوں کو پتا سمجھانے لگا۔ الٹی بخش بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اسے انصاف مل سکے گا۔ سادات کی ویسے ہی اتنی عزت ہے کہ کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ پھر یہاں تو منصف خود بھی سادات ہی میں سے تھا۔ ایسے میں انصاف کی امید وہ کیا کرتا۔

تینوں کانٹیل چلے گئے ”تم یہاں بیٹھ سکتے ہو؟“ ابرار شاہ نے پوچھا ”طبیعت زیادہ خراب ہو تو کھر چلے جاؤ۔“

”میرا رکن ضروری ہے شاہ جی سرکار؟“

”ضروری تو نہیں۔ لیکن رک جاؤ تو میں تمہیں انصاف کا تماشا دکھاؤں گا۔“

”میں رکوں گا شاہ جی۔“ الٹی بخش نے زخمی لہجے میں کہا۔ اس کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔ اس نے سلیمان شاہ کو کتنی معقولیت سے

سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سلیمان شاہ کو نام و نسب کے گھمنڈ نے اندھا کر دیا تھا۔ اس نے یہ تک خیال نہیں کیا کہ اس کا حکم اللہ کے حکم سے متصادم ہے اور اللہ کے حکم سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں۔ الٹی بخش جانتا تھا کہ اس کی کوئی غلطی نہیں۔ رانی برابر بھی نہیں۔ یہ تالی ایک ہاتھ سے جچی ہے۔ سلیمان شاہ نے زیادتی کی

ہے اور اسے سزا اس کے سامنے ملنی چاہئے۔

اسی لمحے اس کا باپ پیر بخش ہڑ دایا ہوا ابرار شاہ کے کمرے میں داخل ہوا ”کیا ہوا میرے بیٹے؟“ وہ الٹی بخش کی طرف لپکا ”یہ کیسے ہو گیا۔ مجھے قاضی نے بتایا آکر۔“

الٹی بخش خیر کا بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”زخم کرا ہے لیکن خطرناک نہیں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا بیٹا بچ گیا۔“ ابرار شاہ نے کہا۔

الٹی بخش نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے سلام کیا ”معاف کرنا مائی باپ۔ اس کی پریشانی میں آپ کا خیال ہی نہیں رہا۔“ وہ پھر الٹی بخش کی طرف مڑا ”کس نے مارا ہے تجھے؟ مجھے بتا میں خون پی جاؤں گا اس کا۔“

”نہیں پی سکو گے ابا۔“ الٹی بخش نے سرد لہجے میں کہا۔

”سلیمان شاہ نے میرے سر پر کھماڑی ماری ہے۔“ پیر بخش کے چہرے پر زلزلے کا اثر ابھرا ”یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹے۔ تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”یہ یاسی ہوا ہے ابا۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مارنے سے پہلے وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔“

”بیٹے۔ اندھیرے میں تو ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا ہو گا۔“ پیر بخش نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

”ابا۔ اندھیرا نہیں تھا۔ اور میں نے کمانا کہ پہلے اس نے مجھ سے باتیں کی تھیں۔“

پیر بخش کا چہرہ ایسا پیلا ہو گیا جیسے کسی نے اس کے جسم کا پورا خون نچوڑ لیا ہو۔

”جاؤ ابا! اب اس کا خون پی جاؤ۔ اس نے بلاوجہ مجھے مارا ہے۔“ الٹی بخش نے کہا۔

پیر بخش نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ابرار شاہ کی طرف مڑا ”مائی باپ! ابھی پرچہ تو نہیں کاٹا ہے آپ نے؟“

”ابھی تو نہیں کاٹا ہے کاٹنے والا تھا کہ تم آگئے۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ پیر بخش نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

”صاب جی یہ پرچہ نہیں کاٹنا۔ کاٹنا تو اس میں شاہ جی کا نام درج نہ کرتا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”عملہ آورنا مظلوم دکھاتا۔“

”لیکن حملہ آورنا مظلوم نہیں ہے۔“ الٹی بخش نے احتجاج کیا۔

”میں سلیمان شاہ کو جانتا ہوں۔“

”تو چپ رہ۔“ پیر بخش نے اسے لپٹا۔ پھر وہ ابرار شاہ کی طرف مڑا ”صاب جی! خدا کے لئے پرچہ نہ کاٹنا۔“ اس نے التجا کی۔

”پرچہ تو کٹے گا بڑے میاں۔“ ابرار شاہ نے کہا ”یہ عکین معاملہ ہے۔“

پیر بخش تیزی سے اٹھا اور اپنی پگڑی ایس ایچ او کے قدموں میں ڈال دی ”صاب جی! میری عزت کا خیال کریں۔“

ابرار شاہ کے چہرے پر حیرت تھی ”آپ مجرم کو بچانے کی بات کرتے ہو۔ جبکہ جرم آپ کے شکے بیٹے کے خلاف ہوا ہے!“

”کوئی جرم نہیں ہوا صاب جی۔ یہ تو گھر کی بات ہے۔ آقا اور غلام کا معاملہ ہے۔ آقا غلام کو مارے تو یہ جرم نہیں ہوتا۔“ پیر

بخش نے کہا اور پھر گڑ گڑانے لگا ”صاب جی! میری عاقبت بچالو صاب جی۔ حضورؐ کی اولاد کے خلاف مدعی بنوں گا تو قیامت کے دن

ان کے پاؤں پکڑ کر شفاعت کے لئے کیسے کموں کا صاب جی۔ کیا منہ لے کر جاؤں گا صاب جی۔۔۔“

ابرار شاہ سنائے میں آگیا۔ پیر بخش کے لہجے میں ایسی شدت تھی کہ وہ دہل کر رہ گیا تھا۔ الٹی بخش جو خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا اب چپ نہ رہ سکا ”ابا۔۔۔ میں مر بھی سکتا تھا۔ جا کر ڈاکٹر

سے پوچھ لو۔“

”لیکن تو مرا تو نہیں بیٹے۔ اللہ نے تجھے اسی لئے بچا لیا کہ تجھ پر اٹھنے والا ہاتھ نہی پاک کی اولاد کا تھا۔“

”نہیں ابا۔ نبیؐ کی اولاد پر کسی انسان کا خون معاف نہیں ہے۔“

پیر بخش دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا ”کفر مت بک۔ اپنے قد سے بڑی بات اچھی نہیں ہوتی اور وہ بھی اتنی بڑی بات۔“

”اچھا بڑے میاں! اگر تمہارا بیٹا مر جاتا تو تم کیا کرتے؟“ ابرار شاہ نے پوچھا۔

”میں تب بھی کہتا کہ پرچہ نہ کاٹیں۔ میں بیٹے کا خون معاف کر دیتا۔“

”لیکن پرچہ تو کٹے گا بڑے میاں۔“

”میں نے اپنی پگڑی آپ کے قدموں میں ڈال دی ہے صاب جی۔“

”مگر تمہارا بیٹا پرچہ کڑا چاہتا ہے۔ اور میں بھی مجرم کو رعایت دینے کے حق میں نہیں ہوں۔“

”میں اس کا باپ ہوں صاب جی۔“ پیر بخش نے افسردگی سے کہا ”اس کی بات میری بات سے بڑی تو نہیں۔“

”اس کی بات زیادہ بڑی ہے بڑے میاں۔“ ایس ایچ او نے سرد لہجے میں کہا ”یہ مدعی ہے تم نہیں۔ فیصلہ اس کے ہاتھوں میں ہے۔“

پیر بخش بے بسی کے احساس سے شل ہو کر رہ گیا ”خدا کے لئے صاب جی۔۔۔“

”دیکھو بڑے میاں! میں بھی سید ہوں۔“ ابرار شاہ نے کہہ ”اور یہ ملازمت میرے لئے پل صراط ہے۔ میں کسی کو رعایت دینے کا قائل نہیں۔ پھر یہ تو قانون کا معاملہ ہے۔ مدعی جو چاہے

رپورٹ درج کر سکتا ہے۔“

پیر بخش اپنی بخش کی طرف مڑا ”دیکھ بیٹے میں تیرا باپ ہوں لیکن اس معاملے میں تیرے پاؤں بھی پڑ سکتا ہوں۔“

”بابا بے کار ضد نہ کرو۔ اسے سزا ملنی ہی چاہئے۔“ الہی بخش

بولے۔ ”اب کیا یہ بات منوانے کے لئے اپنی جگہ تیرے قدموں میں ڈالنی پڑے گی۔“ پیر بخش نے دل گرفتگی سے کہا ”کاش تو مر جاتا۔ تب تو مدی میں ہی ہوتا۔ کاش ایسا ہی ہوا ہوتا۔“

الہی بخش کے جسم میں واضح طور پر قہر قہری دوڑ گئی ”ٹھیک ہے اب۔ میں اس کے نام کا پرچہ نہیں کھاتا۔“

پیر بخش اس کی طرف بڑھا ”میں تیرا شکر گزار ہوں بیٹے۔“ اس نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا لیکن بیٹے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ”تو مجھ سے بہت خفا ہے بیٹے اس بات پر۔“ پیر بخش نے افسردگی سے کہا ”لیکن حشر کے دن تو سرخرو ہو گا بیٹے۔ تب میری بات تیری سمجھ میں آئے گی۔“

ابرار شاہ اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے بڑے میاں۔ تم جیت گئے۔“ اس نے کہا ”لیکن اس سید زادے کو ایک سبق تو میں دے ہی دیا۔ عزت کا سبق! جو صرف بے عزتی سے ملتا ہے۔ ابھی وہ ہتھکڑیاں لگائے ہوئے یہاں آئے گا اور راستے میں سب اس کا تماشا دیکھیں گے۔“

یہ سن کر پیر بخش کا چہرہ فق ہو گیا ”یہ آپ نے کیا کیا شاہ جی۔“ اس نے تڑپ کر کہا ”ہم گناہ گار تو کہیں کے نہیں رہے۔“ اس نے ملامت آمیز نظروں سے بیٹے کو دیکھا ”سچ ہے کہ اولاد سب سے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اولاد آدمی کو جنم رسید بھی کر دیتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے چلا گیا۔“

اس کے جانے کے بعد ابرار شاہ نے حیرت سے کہا ”تمہارا باپ اس دنیا کا آدمی تو نہیں لگتا۔“

”بابا کا خیال ہے کہ میں اس کا بیٹا نہیں۔ کسی نے بدل دیا تھا مجھے۔“ الہی بخش نے سنجی سے کہا۔

○☆☆○

پیر بخش ہانپتا ہانپتا ناڑی کے کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر بھیج رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بس ایک دعا تھی ”سلیمان شاہ کی رسوائی سے پہلے وہ اس تک پہنچ جائے۔ اس کا ہتھکڑیوں والا تماشا نہ شروع ہوا ہو۔“

لیکن دعائیں ایسے کہاں قبول ہوتی ہیں۔

اسے دور سے پولیس والوں کے ساتھ سلیمان شاہ آتا دکھائی دیا۔ ایک پولیس والا آگے چل رہا تھا۔ وہ اس کے دائیں بائیں تھے۔

پیر بخش کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اسے لگا کہ سانے کھلا ہے۔ اور وہ مدد کوئی ہے جس نے نیا کے جیتے نواسے کو پیاس کے صحرا میں دھکیل دیا ہے۔ اس

کے دل میں بس ایک خیال تھا۔۔۔۔۔ قیامت کے دن وہ کس منہ سے حضورؐ کے حضور پیش ہو گا۔۔۔۔۔ آپؐ پوچھیں گے تو کیا جواب دے گا۔

وہ بے تاب ہو کر ایسا دوڑا کہ زندگی میں کبھی نہیں دوڑا تھا۔ وہ ان کے پاس پہنچ کر رکھا اور بے تابانہ سلیمان شاہ کے ہتھکڑی لگے ہاتھ جوڑنے لگا ”شاہ جی۔۔۔۔۔ میرے سرکار! آپ کو آپ کے بزرگوں کی قسم! ہمیں معاف کر دینا۔“

سلیمان شاہ کا بے تاثر چہرہ پتھر کا بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اسے جیسے گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں تھا۔ توہین اور بے عزتی کے احساس نے اسے شل کر کے رکھ دیا تھا۔

”مجھے پتا نہیں تھا شاہ جی۔ ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ وہ میرا بد نصیب بیٹا کچھ نہیں جانتا۔ اس نے اپنی عاقبت خراب کی اور میری بھی۔۔۔۔۔“

اچانک سلیمان شاہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا ”نہیں چاہا پیر بخش، غلطی میری تھی۔ الہی بخش کی نہیں۔“ اس نے شرم ساری سے کہا ”میں سزا کا مستحق ہوں۔ مجھے سزا ملنی چاہئے۔ میں نے ظلم کیا ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی پڑ گئی تھی۔“

”نہیں شاہ جی۔ پٹی تو میرے بیٹے کی عقل پر پڑی تھی۔۔۔۔۔“

”او بابا جی ہٹ ایک طرف۔“ آگے چلنے والے نوروز خان نے پیر بخش کو ٹھٹ کر کہا ”ہمیں تھانے پہنچنا ہے۔“

”ہمتا ہوں۔ آپ ان کی ہتھکڑیاں تو کھول دو۔“

”دماغ خراب ہوا ہے۔“ نوروز خان بگڑ گیا ”تمہاں دار صاحب کا حکم ہے۔ یہ ہتھکڑیاں تو اب وہی کھول سکتے ہیں۔ ہٹ جا بابا۔“

”کیوں گناہ کھاتے ہو حوالدار۔ ان کے ہاتھ کھول دو۔ یہ بھاگنے والے نہیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں ان کی۔“

”کو ضمانت لینے والے کو تو دیکھو ذرا۔“ نوروز خان نے حقارت سے کہا۔

”میرا حق ہے یہ۔“ پیر بخش کا لہجہ بدل گیا ”جس سے ان کا جھگڑا ہوا ہے وہ میرا ہی بیٹا ہے۔“

نوروز خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ہتھکڑیاں کھول دیتا۔ لیکن جانتا تھا کہ ابرار شاہ کتنا سخت اور اصول پرست آدمی ہے۔ چنانچہ اس نے نرم لہجے میں کہا ”بابا جی! یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ مجھ کو معافی دو۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ چلو۔ ہتھکڑیاں مجھے لگا دو۔“ پیر بخش بولا۔

”او بابا! جان چھوڑ دو میری۔ میں مجبور ہوں۔ تھانے دار تو مجھے جان سے مار دے گا۔“

”شاہ جی کے ہتھکڑیاں لگی رہیں گی تو میں اپنی جان دے دوں گا۔“ یہ کہہ کر پیر بخش نے زمین سے سر ٹکراتا شروع کر دیا۔ تینوں کانٹیل بول کھلائے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔ سلیمان شاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس پر تو جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔

دیکھتے دیکھتے اس کی پیشانی سے خون نکلنے لگا۔

”کھل دو بار۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ نوروز خان نے اپنے ساتھیوں سے بے بسی سے کہا۔ پھر وہ پیر بخش کی طرف مڑا۔
”جل۔ اٹھ جا۔“

○☆○

راضی نامہ ہو چکا تھا۔ اہی بخش اور اس کا باپ جاچکے تھے۔ راضی نامہ مکمل طور پر یک طرفہ تھا۔ ابرار شاہ نے کوشش کی تھی کہ اہی بخش کا دوا دار کا خرچہ سلیمان شاہ برداشت کرے اور اس کے علاوہ بھی کچھ نقد رقم دے۔ لیکن پیر بخش نے انکار کر دیا۔ اہی بخش یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ اس نے معاملہ باپ پر چھوڑ دیا ہے۔

”چچا۔ اب میں جاؤں؟“ سلیمان شاہ نے ابرار شاہ سے پوچھا۔

”ذرا بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ ابرار شاہ نے کہا۔

جب سے سلیمان شاہ تھانے آیا تھا، مسلسل کھڑا ہی تھا۔ ابرار شاہ نے اسے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ یہی نہیں، اس نے ابرار شاہ کو چچا کہہ کر پکارا تھا تو اسے ڈانٹ سنتا پڑی تھی۔ ابرار شاہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ رشتے داری گھر میں ہوتی ہے، تھانے میں نہیں۔ یہاں وہ الٹا سچا اوہ ہے اور وہ طرہ۔

سو اب سلیمان شاہ بیٹھتے ہوئے جھپکا رہا تھا۔ ابرار شاہ نے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ سلیمان۔ اس وقت تم طرہ نہیں ہو۔ میرے چھوٹے ہو۔ مجھے تم کو کچھ سمجھانا ہے۔“ سلیمان شاہ بیٹھ گیا۔

”تمہیں اندازہ ہے کہ تم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے؟“

”جی چچا۔ میں جانتا ہوں۔“

”یہ ۳۰۷ کا کیس تھا۔ اور میں پرچہ کاٹ دیتا۔ تمہاری جگہ میرا بیٹا ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھی رعایت نہ کرتا۔“ ”جانتا ہوں چچا۔ اور مجھے آپ پر فخر ہے۔ میرے دل میں آپ کی عزت اور پردہ مگلی ہے۔“

”میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں بیٹے کہ یہ لوگ آل رسول ہونے کے ناتے ہمارا جو احترام کرتے ہیں تو یہ ہم پر بھی قرض ہے۔ ہمیں خود کو محترم بنانا چاہئے۔ اچھی صفات پیدا کرنا چاہئیں اور ان حقیقت منوں کی عزت بھی کرنی چاہئے۔ میں جانتا ہوں، تم اچھے کردار کے لڑکے ہو۔ کوئی برائی نہیں تم میں۔ پھر بھی۔۔۔“

”چچا۔ آپ یقین کریں۔ میں ابتداء ہی سے شرمندہ ہوں۔ اور میں چاہتا تھا کہ مجھے اپنے کئے کی سزا ملے۔“

”جانتے ہو تم سے یہ غلطی کیوں ہوئی؟“

”چچا۔ میں بے ایمانوں کے اکسائے میں آگیا تھا۔“

”اور اس کا سبب یہ تھا کہ تمہیں اپنے نام و نسب پر غور

ہے۔ گھمنڈ ہے اور یہ دنیا کی بدترین چیز ہے۔ اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ توی غرور کس چیز پر کرے۔ جبکہ سبھی کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اسی لئے تو سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں۔ اس کی دی ہوئی عزت پر گھمنڈ کرنا چھوڑ دو۔ اچھے اور مثالی انسان بنو۔ اس لئے کہ یہ عزت کرنے والے حقیقت مند ہم سے یہی توقع کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ تم کبھی اس حیثیت میں یہاں نہیں آؤ گے۔“

”چچا۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“

○☆○

یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ جرگہ کس نے بلایا۔ گاؤں میں سادات کی اکثریت تھی۔ سارے بڑے اکٹھا ہوئے۔ مسئلہ وہی تھا۔ اہی بخش کے ساتھ سلیمان شاہ کی زیادتی۔

”میں مانتا ہوں کہ سلیمان نے بہت زیادتی کی۔“ سلیمان شاہ کے باپ عرفان شاہ نے کہا ”خود سلیمان بھی بہت شرمندہ ہے۔“

سب لوگ سلیمان شاہ کی طرف متوجہ ہو گئے ”یہ سچ ہے بزرگو۔ مجھے شروع ہی میں احساس ہو گیا تھا۔ میں تو معافی مانگنے والا تھا لیکن چاچا پیر بخش نے روک دیا۔“

”چلو، یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تمہیں غلطی کا احساس ہو گیا۔“ گاؤں کے سب سے بڑے افسر شاہ نے کہا ”اور غلطی پر معافی مانگنے میں بڑائی بھی ہے لیکن بیٹا، صرف معافی سے کچھ نہیں ہوتا۔ تلافی بھی ضروری ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا داتا۔“ سلیمان شاہ نے کہا۔ ”پیر بخش نے پرچہ نہیں کٹنے دیا ورنہ پچھری کے چکر لگتے۔ پیسہ الگ خرچ ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں سزا بھی ہو جاتی۔ پھر اس نے تمہیں زبانی معافی تک نہیں مانگنے دی۔ راضی نامہ کرنے کا کوئی صلہ بھی نہیں لیا۔“

”ہاں جی۔ شاہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔“ کسی نے تائید کی۔ ”اور اہی بخش نے یہ سب کچھ تمہارے لئے نہیں کیا۔“ افسر شاہ نے مزید کہا ”تم جانتے ہو کہ کسی حوالے سے اس نے تمہاری عزت کی ورنہ تم کیا ہو۔ اور یہ بھی سن لو کہ اس نے صرف تم پر احسان نہیں کیا، ہم سب پر کیا ہے۔ اور ہمیں اس کا صلہ دینا چاہئے اسے۔“

”آپ حکم کریں دادا۔“ سلیمان شاہ نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پچاس روپے دو۔ پچاس روپے ہم سب اکٹھے کر کے اسے دیں گے اور بھی جو جس کی توفیق ہوگی وہ دے گا۔ ہم سب اہی بخش کی عبادت کو جائیں گے اور یہ سب اسے دیں گے۔“

سلیمان شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ پچاس روپے چھوٹی رقم نہیں تھی۔ پھر یوں ”آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے پیسے دس دن بعد ملیں گے۔“

”میں تمہیں قرض دوں گا۔ دس دن بعد دے دیتا۔“ افسر شاہ نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ پھر وہ دوسروں کی طرف مڑے ”آپ

لوگوں کا کیا خیال ہے؟

سب متفق تھے بات طے پائی۔

○☆☆○

پیر بخش کو اطلاع مل گئی کہ سادات کا جرمہ اس کے گھر آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے بیوی کو بتایا، بیٹوں سے باہر جھڑکاؤ کر کے چارپائیاں باہر لگانے کو کہا اور خود ان کے استقبال کے لئے دوڑ گیا۔

جرمہ گاؤں کی حدود میں داخل ہی ہوا تھا کہ پیر بخش وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سب کی دست بوسی کی اور پھر افسر شاہ کے قدموں میں بیٹھ گیا ”سرکار۔۔۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟“ اس نے لجاجت سے پوچھا۔

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا پیر بخش؟“
”آپ لوگوں نے کیوں تکلیف کی۔ حکم کیا ہوتا تو میں خود حاضر ہو جاتا۔“

”لیکن آتا تو ہمیں ہی تھا پیر بخش۔“ افسر شاہ بولے۔

”مجھے کیوں گناہ گار کیا شاہ جی۔“

”ہم تمہارے بیٹے کی مزاج پر سی کو آئے ہیں۔“

”مجھے کھلایا ہوتا۔ میں اسے خود آپ کے پاس لے آتا۔“

”عمیادت گھر جا کر کی جاتی ہے پیر بخش۔ بیمار کو گھر نہیں بلوایا جاتا۔“ افسر شاہ نے نرم لہجے میں کہا ”اور یہ نبی کریمؐ کی سنت ہے۔“

یہ سن کر پیر بخش گنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ بڑے احترام سے انہیں گھرا لیا۔ وہاں دوسرے بیٹے الٹی بخش کو باہر لے آئے تھے۔ الٹی بخش بھی ان کی پیشوائی کو آگے بڑھا اور دست بوسی چاہی ”الٹی بخش، تم سکون سے چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ تم بیمار ہو۔“ افسر شاہ نے شفقت سے کہا۔

الٹی بخش نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اور بولا ”آپ لوگوں کے سامنے میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔“

”یہ ہمارا حکم ہے۔ ہمارا احترام کرتے ہو تو یہ حکم بھی ماننا پڑے گا۔“

پیر بخش کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ادھر الٹی بخش مستضرانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا ”شاہ جی سرکار۔ اسے اس پر مجبور نہ کریں۔“ وہ گڑ گڑایا۔

”یہ تو تمہارے احترام کی آفاتش ہے۔“ افسر شاہ نے کہا اور الٹی بخش کا ہاتھ تمام کر اسے چارپائی کی طرف لے گئے ”چلو۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔“ وہ اس کے بیٹھنے کے بعد اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھے۔

”اب بتاؤ، طبیعت کیسی ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے شاہ جی سرکار۔“

سب نے الٹی بخش کی مزاج پر سی کی۔ پھر اپنی لائی ہوئی چیزیں اسے دیں۔ ان میں چار مرغیاں، ڈیڑھ درجن انڈے اور کچھ کھجوریں

کھن تھا۔ پیر بخش نے بہت محنت کی لیکن وہ چیزیں اسے لینا پڑیں۔ البتہ پیسوں کے معاملے میں وہ اڑ گیا ”یہ ضد نہ کریں سرکار۔ ورنہ میں جان دے دوں گا۔“ اس نے کہا۔ پیسے اس نے قبول نہیں کئے۔ مگر ایک اور سخت مرحلہ اس کا منتظر تھا۔ سلیمان شاہ نے الٹی بخش سے کہا ”میں دل کی گہرائیوں سے شرمندہ ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں الٹی بخش۔“

اس وقت پیر بخش کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں مٹ جائے۔

شاہ جی لوگوں کے جانے کے بعد اس نے الٹی بخش سے کہا ”یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے بیٹے۔ ہم بہت گناہ گار ہو گئے۔“

”ابا مجھے معاف کر دو۔ مرنا میرے اختیار میں تو نہیں تھا۔“ الٹی بخش نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔ کراچی جائے گا۔

○☆☆○

”تو یہ ہے اس زخم کی کہانی۔“ شیخ صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”جی سر، خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع ہوا۔“ الٹی بخش نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ شیخ صاحب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”میں وقت کبھی ضائع نہیں کرتا الٹی بخش۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا ”میرا وقت بہت قیمتی ہے۔“

”جی سر۔“
”اچھا، اب تم جا کر آرام کرو۔ کل صبح نوبے ٹرائی کے لئے تیار رہنا۔ پھر پرسوں سے تمہاری ڈیوٹی سعدیہ کے ساتھ ہوگی۔ گڈ نائٹ۔“

”گڈ نائٹ سر۔“ الٹی بخش کو عجیب سا لگا۔ یہ لفظ اس نے پہلی بار بولا تھا۔

○☆☆○

وہ الٹی بخش کی زندگی کا یادگار ترین دن تھا، جب وہ پہلی بار سادی کو کالج چھوڑنے گیا۔

اس صبح وہ معمول کے مطابق سویرے اٹھا۔ فجر کی نماز ادا کر کے وہ باغیچے میں آگیا۔ وہ بہت حسین صبح تھی۔ یا اسے حسین لگ رہی تھی۔ گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اسے اپنے اندر روشنی سی اترتی محسوس ہوئی۔ وہ گہری گہری سانسوں کے ساتھ پھپھڑوں میں خوشبو سے بو جھل ہوا کو اتارتا رہا۔ اس صبح وہ بہت خوش تھا۔ کچھ دیر ٹھٹھنے کے بعد وہ کرمو کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

ساڑھے چھ بجے وہ اٹھا اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ کپڑے بدل کے، تیار ہو کے وہ باہر آیا تو نئی چمکتی کار کو اور چکانے میں مصروف ہو گیا۔ چکانا کیا، درحقیقت وہ اسے پیار سے سلا رہا تھا۔

نست کی بات ہے۔ اسے باقاعدہ چلانے کو یہ پہلی کار ملی تھی۔۔۔۔۔
بالکل نئی چمچاتی کار۔

اسے بتایا گیا تھا کہ سادی ساڑھے سات بجے آیا کرے گی۔
لیکن وہ پلا دن تھا شاید اس لئے وہ سوا سات بجے ہی آگئی۔ شیخ
صاحب اور بیگم صاحبہ اس کے ساتھ تھے ”تم تیار ہو؟“ شیخ
صاحب نے الٹی بخش سے پوچھا۔

”جی سر جی۔“
”اس کے لئے یونیفارم کا بندوبست بھی کرو۔“ بیگم صاحبہ نے
اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ”ڈرائیور کو ڈرائیور ہی نظر
آنا چاہئے۔“

”سادی چاہے گی تو یہ بھی ہو جائے گا۔“ شیخ صاحب بولے۔
”نہیں پایا۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ سادی نے کہا ”میں
تماشا نہیں بننا چاہتی۔“

”اس میں تماشے کی کیا بات ہے۔“ بیگم صاحبہ کا منہ بن گیا۔
”اس سے تو شان کا پتا چلتا ہے۔“

”مجھے نہیں چاہئے ایسی شان۔“ سادی نے جھجھکا کر کہا۔
بیگم صاحبہ اسے نظر انداز کر کے الٹی بخش کی طرف متوجہ
ہو گئیں ”گاڑی ذرا احتیاط سے چلانا۔ پتا نہیں تمہیں گاڑی چلانی
آتی بھی ہے یا نہیں۔“

شیخ صاحب کا چہرہ تھما اٹھا ”میں کل ٹرائی لے چکا ہوں۔ یہ
بہت اچھی ڈرائیو کرتا ہے۔“

”آپ کی ٹرائی کا مجھے تو اعتبار نہیں۔ پینٹ کرنے والے کو
ڈرائیو نہ دیا۔“

الٹی بخش کا چہرہ تنپنے لگا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بغیر کسی وجہ
کے بیگم صاحبہ اس سے چڑتی ہیں اور وہ یہاں زیادہ عرصہ کام نہیں
کر سکے گا۔ اس نے دیر سے کہا ”سہو۔ بیگم صاحبہ مجھ سے
مطمئن نہیں تو۔۔۔“

شیخ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر وہ رخسانہ بیگم
کی طرف مڑے ”آپ کو پریشانی کیا ہے؟“

”کار نئی ہے۔ آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔“
”میرے لئے پرانی بیٹی نئی کار سے زیادہ اہم ہے۔ میں اس
معا ملے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں
پوری طرح مطمئن ہوں۔“

”آپ صرف احسان اتارنے کی خاطر۔۔۔۔۔“
اس بار شیخ صاحب کا تحمل جواب دے گیا ”بس رخسانہ بیگم“
انہوں نے بلند آواز میں کہا ”آپ میری نرمی سے ناجائز فائدہ نہ
اٹھائیں۔ اب میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔“

”جہنم میں جائیں۔“ رخسانہ بیگم نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور
دال سے چلی گئیں۔

شیخ صاحب نے کندھے جھٹکے اور الٹی بخش سے بولے ”بیگم

صاحبہ کی باتوں کو مامٹ نہ کرنا۔ میں بھی نہیں کرتا۔ برداشت تو کرنا
پڑتا ہے۔“

”میں کیا مامٹ کروں گا سر۔ بے حیثیت آدمی ہوں۔“
شیخ صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ انہوں نے سعدیہ کے

سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”وقت ہو گیا۔ جاؤ بیٹی۔ خدا حافظ۔“
الٹی بخش نے پچھلا دروازہ کھولا اور سادی کے پیٹھنے کے بعد

اسے بند کر دیا۔ پھر وہ گھوم کر اگلے دروازے کی طرف آیا۔
”خدا حافظ پایا۔“ سادی نے کہا۔

○☆☆○

وہ خوشبو کا پہلا سفر تھا۔
الٹی بخش گاڑی کو باہر سڑک پر لے آیا تھا۔ اس نے بیک ویو

مرر میں دیکھا۔ وہاں سادی نہیں تھی۔ الٹی بخش نے عقب نما
آئینے کو درست کر کے ایسی پوزیشن میں لانے کی کوشش بھی نہیں

کی کہ اس میں سادی نظر آئے۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ
گاڑی میں اس کے ساتھ تھی۔

سادی اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ اس کی ہدایت کے
مطابق گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی خوشبو اس کی روح سے باتیں

کر رہی تھی۔ کوئی بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد سادی نے کالج کے
گیٹ کے سامنے گاڑی رکوا دی۔

”تم، ایک بجے مجھے لے جانے کے لئے آجانا۔“ سادی نے
دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”بی بی، ایک بات بتائیں گی؟“
”نہیں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں سعدیہ ہوں۔ تم مجھے سادی

بھی کہہ سکتے ہو۔“
”میں۔۔۔ نہیں بی بی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”تو چلو۔ اپنی بات بھی رکھ لو اور میری بھی۔ تم مجھے سادی بی بی
کہہ لیا کرو۔“

”یہ ٹھیک ہے سادی بی بی۔“
”اب پوچھو۔ کیا بات ہے؟“

”یہ علاقہ کون سا ہے سادی بی بی۔ کیا نام ہے اس کا؟“
”یہ فریر روڈ ہے۔“

”ٹھیک ہے جی۔ وہ میں پہلی بار اس طرف آیا ہوں۔“
”تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں پورا شہر دکھا دوں گی۔ اب میں

جاؤں؟“
الٹی بخش نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے اجازت

مانگ رہی تھی یا اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ لیکن اس کے چہرے پر
ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی

تھی ”خدا حافظ سادی بی بی۔“
”میری چھٹی ایک بجے ہوتی ہے۔ لیکن کبھی دیر ہونے لگے

تمہیں تو تیز ڈرائیو نہ کرنا۔ میں پانچ دس منٹ انتظار بھی کر سکتی

نہیں۔“

”پھر بھی۔ کچھ تو ہو گا۔“

”بس اتفاق سے نظر اٹھ جاتی ہے۔“ اسی بخش نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ”ورنہ میں تو اس شے کو دیکھتا بھی نہیں۔“

”یہ تو بہت بری بات ہے۔ پھر تم اچھے ڈرائیور تو نہیں ہو سکتے۔“

”کھاڑی میں یہ شیشہ لگا ہے تو اس کا کوئی مقصد استعمال بھی تو ہو گا۔ یہ آرائش کے لئے تو نہیں ہے نا۔“

”برتم تو پیچھے کے ٹریفک پر نظر نہیں رکھتے“

”تو جب میں نے پوچھا تھا کہ تم اس شیشے میں کیا دیکھتے ہو تو تم نے کہا تھا کہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔“ سادی نے شوخ لہجے میں کہا۔

”نہیں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اس شیشے کو بھی دیکھتے رہا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی حادثہ ہو۔“

اس روز سادی کو کالج چھوڑ کر کوٹھی واپس آتے ہوئے الٹی
بخش اس منگٹکو پر سوچتا رہا۔ اب وہ اس شیشے میں سادی کو دیکھ سکتا

خوشبو کے اس سفر میں دن پر لگا کر اڑتے رہے!
اب سفر خاموشی میں نہیں ہوتا تھا۔ ان کے درمیان یک طرفہ

فطرت میں تجسس تو بہت تھا لیکن اس نے اس پر قابو پائے کا طریقہ جان لیا تھا۔ یہ تو اس وقت ہو گیا تھا جب باب اسے عشق کی تلقین

چنانچہ سادی اس سے سوال کرتی رہتی تھی اور وہ جواب دیتا تھا۔ سوالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ سادی کو اس کے بارے میں

بارے میں سوال کرتی۔ اس کے لئے وہ جیسے ہی ہوں گا دیں تھا۔
ہمت؟ ہاتھ اور اسے یقین نہ آتا۔ خاص طور پر وہاں کے معاشرے

میں عورت کا جو مقام اور کردار تھا، وہ اسے اداس کرتا۔ دوسری

لوگ نوکروں سے ایسے بات تو نہیں کرتے۔ اسے ذرا بھی غرور نہیں

اے کسی نے کہا۔

اس سے آگے تو اسے خواب دیکھنے کا حق بھی نہیں۔
وہ ایسا ہے جس سے وہ عالم گما جاوے، اسے سادگی اور سادگی کی حق۔

آج۔ الہ، بخیر، گاڑی صاف کر رہا تھا "مکھڑ مارنگ الہ، بخیر۔"

مارنگ سادی بی بی کہا۔ اس دن کے بعد یہ معمول میں شامل ہو گیا۔

لیکن اس میں سادی کا عکس دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا۔ سادی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

دوسرے کو نے میں بیٹھی تھی۔
 اہم بخش کی نظرس جک منظر۔

اس روز الہی بخش نے جب بھی نظرس اٹھا کر عقب نما آئینے میں دیکھا، سادی کو کھڑکی سے باہر دیکھتے پایا۔ لیکن ہر بار اسے یہ

”ہر اچانک سادی نے پوچھا ”یہ تم بیک ویو مر میں کیا دیکھتے ہو؟“

اسی بخش ہو کھلا گیا ”جج۔ جی۔ لگ۔ کچھ نہیں۔ کچھ بھی

طرف وہ اس علاقے کے قدرتی حسن کے متعلق سن کر بہت خوش ہوئی۔ ”ہائے... وہ تو سچ عجیب خوابوں کی سرزمین ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر کہتی ”کاش میں بھی کسی ایسی جگہ رہ سکتی۔“

الٹی بخش کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ خوابوں کی سرزمین کا کیا مطلب ہے۔ وہ ایسٹ آباد میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں ہی خوب صورتی میں کھولی تھیں۔ اس کے لئے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اسے تو کراچی زیادہ اچھا لگتا تھا ”وہاں رہنا آسان نہیں ہے سادی بی بی۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”وہاں کی زندگی رو مینٹلک بہت ہے۔“ الٹی بخش نے پچھلے والے سے کہا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھتی۔“

”وہاں روزگار نہیں ہے۔ اس لئے تو ہم لوگ یہاں فنٹ پاتھ بیٹھنے کو اپنے گھر پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہاں کی ہماری زندگی یہاں کی زندگی سے بھی زیادہ رو مینٹلک ہے۔“

سادی کو وہ حوالہ یاد آگیا اور وہ شرمندہ ہو گئی ”تمہیں اس دن کی لگی تھی میری بات؟“

”نہیں سادی بی بی۔ مجھے تو اچھا لگا تھا۔ مگر میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ آپ وہ زندگی خود گزاریں تب بھی وہ آپ کو رو مینٹلک لگے گی؟“

”بہت مشکل سوال ہے۔ شاید کسی دن میں تمہیں اس کا جواب دے سکوں۔“ سادی نے کہا اور پھر گفتگو کا رخ بدلا ”اتنا خوب صورت علاقہ ہے تمہارا۔ اس کی وجہ سے کم از کم ایک بہت بڑی بچت تو ہوگی۔“

”کیسی بچت سادی بی بی؟“

”تمہاری شادی ہوگی تو ہنی مون پر تمہارا زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔“

”ہنی مون؟ یہ کیا ہوتا ہے؟“

سادی ہنی مون کے متعلق سمجھانے لگی۔

”ہمارے ہاں یہ بھی نہیں ہوتا۔“ الٹی بخش نے اس کی بات

سننے کے بعد سادی سے کہا ”ہمارے ہاں تو میاں بیوی ساتھ بھی بیٹھتے کبھی۔ خود میں نے ابا اور اماں کو کبھی ایک ساتھ بیٹھے میں دیکھا۔“

سادی بھونچکا رہ گئی ”کیوں بھی؟“

”ہمارے ہاں شرم و لحاظ بہت ہے۔ کنبے کا کنبہ ساتھ رہتا ہے۔ لحاظ رکھنا پڑتا ہے ورنہ لوگ بے شرم کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔“

”یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔“ سادی نے کہا ”میں نے قرآن

پاک میں پڑھا ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ اس سے قریبی کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

اس لمحے الٹی بخش کو وہ بہت بے شرم لگی۔ اسے افسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں سادی کا جو تصور تھا وہ بھی مجروح ہوا۔ لیکن اس نے حوالہ قرآن پاک کا دیا تھا۔ پھر بھی اس نے دھیرے سے کہا۔

”اللہ نے شرم و حیا کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کی بہت تلقین کی ہے اور پھر تمنا کی اور محفل کے الگ الگ آداب ہوتے ہیں۔“

”میں صرف اس بات پر اعتراض کر رہی ہوں کہ میاں بیوی کا دوسروں کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا بے شرمی تو نہیں ہوتا۔ خیر یہ تمہارے ہاں کا قاعدہ ہے۔ تو مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہئے۔“ یہ کہتے کہتے سادی کے لمبے میں بے رخی آگئی۔

الٹی بخش خاموش ہو گیا۔ اس نے تو صرف محبت کی تھی۔ اگر سادی کو پانے کی آرزو کی ہوتی تو کچھ اسے سمجھانے کی کچھ خود سمجھنے کی کوشش بھی کرتا۔ لیکن ایک تو وہ جانتا تھا کہ وہ زمین پر کھڑا ہے جبکہ سادی آسمان پر چمکنے والا چاند ہے جس سے وہ باتیں کر سکتا ہے جسے وہ دیکھ سکتا ہے، لیکن اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اسے ہاتھ پیرھا کر چھو نہیں سکتا۔ دوسرے اسے جس عشق کی گھٹی پلائی گئی تھی اس میں صلے اور مال کا کوئی تصور نہیں تھا۔

سادی نے اس کی خاموشی کو ناراضی پر محمول کیا۔ وہ بولی۔

”ناراض ہو گئے کیا؟“

”نہیں سادی بی بی۔ آپ سے میں کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ کچھ بھی کر لیں۔“

”بہت بڑی بات کہہ رہے ہو۔ کبھی ایسا ہوا تو یاد ضرور دلاؤں گی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا سادی بی بی۔“ الٹی بخش نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”چلو... دیکھیں گے۔“

ایک اور موقع پر سادی نے اس سے پوچھا ”تمہاری بیوی بھی تمہارے ساتھ ایسے ہی رہے گی، جیسا تمہارا قاعدہ ہے؟“

”جی سادی بی بی۔ آدمی اپنے ہاں کے رواج تو نہیں توڑ سکتا۔“

سادی کچھ دیر سوچتی رہی ”اور جو تمہاری شادی کسی شہری لڑکی سے ہوگئی تو؟“

الٹی بخش کی نظریں بے ساختہ انھیں۔ اس نے عقب نما میں دیکھا۔ سادی پہلے ہی اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر الٹی بخش سامنے دیکھنے لگا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے سادی بی بی؟“

”ہو کیوں نہیں سکتا۔ کہتے ہیں جوڑے تو آسمان پر بنے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ پر میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں... تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا؟“

”بس میرا دل بتاتا ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔“ الہی بخش نے پوری سچائی سے کہا۔ اس کا دل واقعی یہی کہتا تھا۔
”اور فرض کرو ایسا ہو گیا پھر؟“

الہی بخش چند لمحوں سوچتا رہا۔ پھر بولا ”تو اس لڑکی کو میرے لئے رسائی بنا ہوگا۔“

”حالا نکہ تمہیں اس کی خاطر شہری بن جانا چاہئے۔“ سادی نے کہا ”سوچتی ہوں“ تم شہری بن کر کیسے لگو گے۔“

”کیسا بھی نہیں لگوں گا۔ اس لئے کہ بنوں گا ہی نہیں۔“ الہی بخش نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ گاڑی کالج کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔

”چھ“ الہی بخش ”خدا حافظ۔ ایک بجے۔“
”ٹھیک ہے سادی بی بی۔ خدا حافظ۔“

○☆☆○

الہی بخش موجودہ وقت کا تقابل اس وقت سے کرتا جب اس نے سادی کو دیکھا تھا۔ اس سے ملا نہیں تھا تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ بڑے خسارے میں ہے۔ اب سادی اس کی نظروں کے سامنے ہوتی تھی، بہت قریب بھی ہوتی تھی مگر اب سرشاری کی وہ کیفیت نہیں ہوتی تھی جس میں اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ جس میں بھوک پیاس کا احساس بھی مٹ جاتا تھا۔ کوئی تکلیف تکلیف نہیں رہتی تھی۔ وہ خوش رہتا تھا۔۔۔ خوش اور مست۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ قربت محبت کو کم کر دیتی ہے۔ محبوب نظروں کے سامنے نہ ہو تو اس کا تصور بڑا ہوتا ہے۔ اس میں صرف خویاں ہی خویاں ہوتی ہیں۔ اس کی خامیوں کا علم نہیں ہوتا۔ لہذا اس کا مرتبہ بلند ہی رہتا ہے۔

تو کیا سادی کا مرتبہ کم ہو گیا ہے؟ اس نے سوچا اور اس سوال پر دیر تک سوچتا رہا۔ سادی کا مرتبہ کم تو نہیں ہوا تھا مگر یہ تھا کہ پہلے وہ عام انسان نہیں لگتی تھی۔ جیسے کوئی خاص ہستی ہو۔ آسمان سے اتری ہوئی۔ اب وہ ایک لڑکی لگتی تھی جس پر وہ نکتہ چینی بھی کر سکتا تھا۔

الہی بخش خود کو ٹوٹتا رہا۔ سادی بہت اچھی، بہت پیاری لڑکی تھی۔ مگر اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ بے حجابانہ اس سے وہ گفتگو بھی کر لیتی تھی جو اس کے خیال میں معیوب تھی بلکہ شاید وہ اس سے ہر موضوع پر بات کر سکتی تھی۔ جبکہ ایسا صرف دوستوں کے درمیان ہو سکتا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے الہی بخش کو خیال آیا کہ وہ ایک اہم بات نظر انداز کر رہا ہے۔ یہ اپنی اپنی تربیت، اپنے ماحول اور اپنی سوسائٹی کے رسم و رواج کی بات ہوتی ہے کہ کیا معیوب ہے اور کیا نہیں۔ اس بنیاد پر کوئی کسی پر بے شہری کا فتویٰ نہیں لگا سکتا۔ یوں تو سادی بھی ان پر اعتراض کر سکتی ہے۔ مثلاً یہاں بیت الخلا ہر گھر میں ہوتا ہے جبکہ گاؤں میں لوگ دفع حاجت کے لئے باہر جاتے

ہیں۔ تو شہر کے لوگ اسے بے شہری قرار دیں گے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی کہ اتنی زمین ہوتے ہوئے گھر میں بیت الخلا کی تنجائش کیوں نہیں نکالی جاسکتی۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ ہزارے میں نوکروں کے ساتھ ایسا سلوک بھی نہیں ہوتا۔ اتنی بے تکلفی سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، کوئی نوکر کو اپنے پاس بھی نہیں بٹھاتا۔ نوکروں کو منہ ہی نہیں لگایا جاتا۔ تو جب یہ بات ہزارے سے متصادم ہونے کے باوجود اسے اچھی نہیں لگتی تو دوسری باتیں بری بھی نہیں لگنی چاہئیں۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اسے سادی سے محبت ہے۔ بلکہ عشق ہے۔ تو عشق انسان کی خویہوں سے نہیں، خود انسان سے ہونا چاہئے۔ سادی کی بدترین برائی سے بھی اس کا دل اس کی طرف سے برا نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس نے کوئی بالا ارادہ تو عشق نہیں کیا۔ یہ جذبہ تو اس کے دل میں ڈالا گیا ہے۔ نہیں۔ اسے سادی کو کسی قیمت پر برا نہیں سمجھنا چاہئے۔ اور پھر کون جانے، یہ کتنے دن کا ساتھ ہے۔ اسے تو بس سادی کو خوش کرنا چاہئے۔

قریب آنے سے ایک نقصان اور ہوا تھا۔ پہلے وہ آنکھیں موندتا تو وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوتی تھی۔ گھنٹوں وہ اس سے باتیں کرتا تھا۔ باتیں تو وہ اب بھی کرتی تھی اس سے۔ لیکن اس میں وہ لذت نہیں تھی۔ پہلے وہ کم سوتا تھا۔ سوتا تھا تو وہ اس کے خواب میں بھی ضرور آتی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح سوتا تھا۔ زیادہ تر خوابوں سے محروم نیند۔ صبح سو کر اٹھنے میں بھی وہ لذت نہیں رہی تھی۔

الہی بخش اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ محرومی بڑی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ ناشکرا پن کر رہا ہے۔ باپ نے ہمیشہ اسے یہی تو سمجھایا تھا کہ شکر گزاری نہ چھوڑو۔ شکر گزاری ہے تو عشق بھی کر سکتے ہو۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کرنے لگا۔ اسے تو وہ ملا تھا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

اس کے وجود میں شکر گزاری موج در موج امنڈنے لگی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے وہ سرشاری محسوس کی جو میمنوں اس کا معمول رہی تھی۔

○☆☆○

اس روز سادیہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ الہی بخش نے کئی بار نظریں اٹھا کے عقب نماشیے میں دیکھا۔ لیکن وہ سوچ میں گم رہی۔ وہ بھی پوری طرح ڈرائیو تک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن اس کا دل پریشان ہو گیا۔ سادی پریشان تھی۔ لیکن کیوں؟ اچانک سادیہ نے اسے پکارا ”الہی بخش“ ایک بات پوچھوں۔

”جی ہاں؟“

”سادی بی بی۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ الہی بخش نے سادیہ کی طرف سے کہا۔

”لیکن کبھی کبھی جھوٹ نہیں بولنے والے بھی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں نہیں۔ میرے ساتھ تو آج تک ایسا نہیں ہوا۔ خیر آپ پوچھیں۔“

”تم نے کبھی محبت کی ہے کسی سے؟“

”میں تو نسلی اصلی عاشق ہوں سادی بی بی۔“ الہی بخش نے عقب نما شیشے میں دیکھا۔ سادی حیران نظر آ رہی تھی ”کیا بات ہے آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ اور وہ بھی ان الفاظ میں۔“

”جو سچ تھا، جیسا تھا ویسے ہی کہہ دیا۔“

”ذرا وضاحت تو کرو۔“

”ہماری نسل ہی محبت کرنے والی نسل ہے۔“ الہی بخش نے گہری سانس لے کر کہا ”ابا بچپن ہی سے مجھے عشق کی تلقین کرتے تھے۔ لیکن مجھے عشق نہیں ہوا۔ میں عشق سے لڑتا رہا۔ مجھے عشق برا لگتا تھا۔“

سادی اب بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ الہی بخش نے وضاحت کرتے ہوئے اسے اپنے جدی عشق کے بارے میں بتایا۔

”پہلے تم نے کہا کہ تم نسلی عاشق ہو۔ پھر تم نے کہا کہ تم عشق سے لڑتے رہے۔ یہ تو متضاد بات ہے۔“

”ہاں سادی بی بی۔ میں لڑتا رہا۔ مگر اب میری سمجھ میں عشق آنے لگا ہے۔ اب میں محبت کرنے لگا ہوں۔“

”کس سے؟“

”مجھے ہر انسان سے محبت ہے سادی بی بی۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ سے عشق کرنے کی یہی صورت ہے۔“

”پھر بھی یہ تو بتاؤ کس سے محبت کرتے ہو تم۔“

”میں نے بتایا، ہر انسان سے۔ ماں باپ سے، بہن بھائیوں سے، رشتے داروں سے، آپ کے پاپا سے، کرمو چاچا سے، اعلیٰ ریا سے، آپ کی امی سے۔۔۔ سب سے سادی بی بی۔“

”ادھر دیکھو۔“ سادی نے کہا۔ الہی بخش نے عقب نما میں دیکھا ”تم نے میرا نام نہیں لیا۔ اس کا مطلب ہے میں بالکل اچھی نہیں ہوں۔“

الہی بخش نے نظریں جھکا لیں ”کسی کے منہ پر یہ کہنا جھوٹا جھوٹا لگتا ہے اس لئے میں نے آپ کا نام نہیں لیا تھا۔“

”تو تم مجھے اچھا سمجھتے ہو۔ مجھ سے محبت کرتے ہو؟“

”جی سادی بی بی۔“

سادی شیشے میں اس کے عکس کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”ایک بات اور۔ آدمی سب سے برابر کی محبت تو نہیں کرتا۔ کسی سے کم، کسی سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بتاؤ، میرا کون سا نمبر ہے۔ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو تم؟“

”یہ بتانا تو ناممکن ہے بی بی۔ محبت آدمی نہ من سیر جھٹاک میں کرتا ہے، نہ گزشتہ انچ میں۔ سچ یہ ہے کہ میں خدا سے اور اس کے پیارے رسولؐ سے عشق کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ انسان تو بس سیر جھٹاک میں۔“

سادی نے دیکھا تھا کہ اس کی محبت کے نام پر الہی بخش کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا تھا ”یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

اس نے کہا ”اور میں اس محبت کی بات بھی نہیں کر رہی تھی۔“

”محبت تو بس محبت ہوتی ہے۔ کسی سے بھی ہو۔“ الہی بخش نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کبھی کسی لڑکی سے بھی محبت کی۔۔۔“

”ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانیں گی سادی بی بی۔“

”کہو۔۔۔“

”یہ تو بہت ذاتی نوعیت کی بات ہے۔ نہ کسی سے پوچھتے ہیں، نہ کسی کو بتاتے ہیں اور آپ کو مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”کیوں؟ کیا حرج ہے اس میں؟“

”بس یہ اچھی بات نہیں۔“

”میں تو بس سمجھنا چاہ رہی ہوں کہ محبت کیسی ہوتی ہے۔ تم نے منع کیا ہے تو آئندہ ایسی بات نہیں کروں گی۔“

الہی بخش نے شیشے میں اسے غور سے دیکھا ”برا تو نہیں مانیں آپ؟“

”نہیں۔ غلط بات پر تم مجھے ٹوک سکتے ہو۔ یہ حق میں نے تمہیں دیا ہے۔“

الہی بخش حیرت میں ڈوب گیا۔

○☆○

”مگڈ مارننگ الہی بخش۔“

”مگڈ مارننگ سادی بی بی۔“

اس صبح الہی بخش کو احساس ہوا کہ سادی بہت خوش ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی آواز میں چمک رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

”آج آپ بہت خوش ہیں سادی بی بی؟“ الہی بخش نے پوچھا۔

”میں ہر صبح بہت خوش ہوتی ہوں۔“

”لیکن آج ہمیشہ سے زیادہ خوش ہیں۔“

”ہاں، آج موسم بہار کا پہلا گلاب کھلا ہے۔“

الہی بخش کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بچھ لیا۔ اسے یاد ہی نہیں تھا۔ کب سے اسے گھریا نہیں آیا تھا۔ نہ گھر نہ اپنے علاقے کے موسم۔ فٹ پاتھ پر تھا تو وہ ہمیشہ ایسٹ آباد کو یاد کرتا رہتا تھا۔ اب۔۔۔ اب اسے خیال بھی نہیں آیا کہ بار آگئی ہے۔

”کیا بات ہے، تم اداس ہو گئے۔“

”ہمارے اداس کردیا۔ کاش میں اپنی طرف کی بار آپ کو دکھا سکتا۔ ہمارے ہاں بہت بڑے گلاب کھلتے ہیں۔ ایسے کہ ہاتھوں کے پالے کو ایک ہی گلاب بھردے۔“

”تمہیں گمراہ آتا ہے تو چھٹی لے کر کچھ دن کے لئے چلے کیوں نہیں جاتے۔“

”دل ہی نہیں چاہتا جانے کو۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر سادی نے کہا ”میری ایک بات مانو گے؟“

”کیوں نہیں۔ آپ کہیں تو۔“

”مجھے ڈر ہے کہ نہیں مانو گے۔ اور شاید برا بھی مان جاؤ گے۔“

اس پر الٹی بخش چو کنا ہو گیا ”میں تو نوکر آدمی ہوں سادی بی بی۔ پھر ایسی کوئی بات ہے تو آپ مجھ سے کہیں ہی نہیں۔“

”کتنی بھی ضروری ہے۔“

الٹی بخش ہچکچایا۔ پھر بولا ”تو کہہ دیں۔“

”ذرا گاڑی سائیڈ میں روکو۔“ سادی نے فرمائش کی۔

الٹی بخش نے موقع دیکھ کر گاڑی ایک طرف لگادی۔ لیکن وہ اندر ہی اندر پریشان تھا کہ ایسی کون سی بات ہے جس کے لئے گاڑی روکوائی گئی ہے ”جی سادی بی بی۔“ اس نے شیشے میں سادی کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سادی نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے ”یہ لو۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ کہوں گی۔“

الٹی بخش نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر نوٹ تمام لئے مگر پھر وہ پریشان ہو گیا ”یہ۔۔۔ یہ کس لئے سادی بی بی؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم بہت اچھی پینٹ شرٹ بہت اچھے شوز خریدو۔ میں چاہتی ہوں کہ کل صبح تم یہ نئے کپڑے پہن کر باہر آؤ۔“

الٹی بخش کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی ”سادی بی بی۔ پیسے میرے پاس بھی ہیں۔ پوری تنخواہ بچ جاتی ہے میری۔ کوئی خرچ ہے ہی نہیں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن یہ میری خواہش ہے۔“

”مجھے افسوس ہے سادی بی بی۔ یہ میں نہیں کر سکتا۔“ الٹی بخش نے نوٹ پچھلی سیٹ پر گرا دیے۔

”کیوں نہیں کر سکتے؟“

”میں نے نہیں پہنوں کبھی پہنی نہیں۔ مجھے عجیب سا لگے گا۔ تمنا بننے کا احساس ہو گا مجھے۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا سادی بی بی۔“

”مان جاؤ نا۔“

”نہیں مان سکتا سادی بی بی۔ آپ یہ پیسے رکھ لیں۔“ الٹی بخش نے عاجزی سے کہا۔

”اتنی سی بات میری نہیں مان سکتے۔“ سادی رو ہنسی ہو گئی۔

”میں مجبور ہوں سادی بی بی۔“ یہ کہہ کر الٹی بخش نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس کے بعد پورے راستے خاموشی رہی۔ کالج آنے پر سادی اتری اور اس نے معمول کے مطابق الٹی بخش کو خدا حافظ کہا۔ لیکن اس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

واپس آتے ہوئے خود الٹی بخش بہت دل گرفتہ تھا۔ یہ احساس اسے ستا رہا تھا کہ اس نے سادی کا دل دکھایا ہے۔ بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ بس وہ ہونتی نہیں بننا چاہتا تھا۔ پھر سادی نے اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی تھی۔

اس روز وہ بے تابی سے ساڑھے بارہ بجنے کا انتظار کرتا رہا۔ وقت کسی طرح کٹ ہی نہیں رہا تھا۔ زیادہ افسوس اسے اس لئے ہوا تھا کہ سادی نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ یوں بھگتی تھی جیسے اس کے انکار سے اسے دلی تکلیف ہوئی ہو۔

اس روز وہ دس منٹ پہلے ہی کالج پہنچ گیا۔ وہ گاڑی کے باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ سادی آئی تو اس نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ سادی خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ الٹی بخش نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد عقب نما میں دیکھا لیکن سادی کا چہرہ اسے نظر نہیں آیا۔ وہ دوسرے کونے میں بیٹھی تھی۔ پہلے دن کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اسے عقب نما میں اپنی دید سے محروم کیا تھا۔

الٹی بخش کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ سادی نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ آخر کار الٹی بخش سے رہا نہیں گیا۔

”سادی بی بی ناراض ہیں مجھ سے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں الٹی بخش۔ ناراضی کیسی۔ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔“

”میں تو زندگی میں کبھی اپنی مرضی نہیں کر سکا۔“ الٹی بخش نے تلخی سے سوچا۔ تو اب اس کے ساتھ کیا اپنی مرضی کرنی؟ جس سے دل کا روج کا رشتہ جڑا ہے اس نے بریک لگاتے ہوئے گاڑی سائیڈ میں روک دی۔ پھر اس نے پلٹ کر کہا ”لایئے۔ آپ کی خوشی کی خاطر میں آپ کی بات مانوں گا۔“

”یہ تو زبردستی کی بات ہوئی۔“ سادی نے افسردگی سے کہا۔

”میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔“

الٹی بخش کو شرمندگی ہوئی۔ واقعی یہی بات ہنسی خوشی مان لینے میں کیا برائی تھی ”سادی بی بی میں شرمندہ ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا ”اور یقین کریں میں خوشی سے یہ بات مان رہا ہوں۔“

اسی وقت الٹی بخش کی نظر پڑی۔ روپے پچھلی سیٹ پر وہیں بڑے تھے جہاں اس نے گرائے تھے۔ سادی نے انہیں چھوا بھی نہیں تھا۔ اور خود اس نے بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ سادی نے پیسے اٹھا کر اسے دیے۔ اس نے بغیر گنے جیب میں رکھ لئے۔

باقی سفر میں بھی سادی اسی جگہ بیٹھی رہی۔ الٹی بخش کو احساس

تھا کہ وہ اب بھی ناراض ہے۔ لیکن گھر پہنچ کر گاڑی سے اترنے سے پہلے سادی نے کہا ”شکریہ الہی بخش۔“
الہی بخش کھل اٹھا۔ اسے لگا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا۔ اور اب اس کا کفارہ قبول کر لیا گیا ہے۔

○☆☆○

پینٹ شرٹ کی خریداری الہی بخش کے لئے بڑا مسئلہ تھی۔ اس کا اسے تجربہ نہیں تھا۔ سادی کا خیال نہیں ہوتا تو وہ خالی ہاتھ ہی واپس آجاتا۔

اگلی صبح اس کے لئے آزمائش کی صبح تھی۔ وہ دیر تک گاڑی صاف کرتا رہا۔ سادی کے آنے سے دس منٹ پہلے وہ اپنے کوارٹر میں گیا اور کپڑے بدل کر یوں باہر نکلا جیسے کہیں چوری کر کے آ رہا ہو۔ اس نے چوبیسوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ اتفاق سے کرمو چاچا بھی موجود نہیں تھا۔ اور سادی آچکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پہلے آئی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرائی ”السلام علیکم الہی بخش۔“ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے سلام کیا تھا۔ کیا یہ کوئی خاص دن ہے؟ الہی بخش نے سوچا۔

”وعلیکم السلام سادی بی بی۔“ الہی بخش نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔

”سالگرہ مبارک الہی بخش۔“ سادی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

الہی بخش کی سمجھ میں پہلے تو کچھ بھی نہیں آیا اور جب بات سمجھ میں آئی تو اسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ اس نے تاریخ یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ آخر کار اس نے سادی سے پوچھا ”آج کیا تاریخ ہے سادی بی بی؟“

”۱۳ اپریل۔“

الہی بخش کو حیرت ہوئی۔ یہ واقعی اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ اسے خود یاد نہیں رہا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جہاں کا تھا وہاں ان غروں چو نچلوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ پھر بھی اسے بہت اچھا لگا کہ سادی نے اسے اتنی اہمیت دی مگر حیرت اپنی جگہ تھی کہ سادی کو معلوم کیسے ہوا۔

اس نے یہ بات سادی سے ہی پوچھ لی۔

”تم نے ہی بتائی تھی یہ تاریخ۔“

”ہمیں نے؟“ الہی بخش نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ میں تم سے تمہارے متعلق پوچھتی رہتی ہوں۔ مجھے تو بہت کچھ معلوم ہے تمہارے بارے میں۔ تمہارا پتا بھی ہے میرے پاس۔“

الہی بخش کو احساس ہوا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کرتا رہا ہے لیکن نہیں۔ باتیں تو سادی بہت کرتی تھی بلکہ وہ سوال بہت کرتی تھی۔ وہ بس جواب دیتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو واقعی اس کے

بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ یعنی۔۔ یعنی وہ اس کی پروا کرتی ہے۔ اس پر الہی بخش نے دل ہی دل میں خود کو ٹیٹ دیا۔ خوش فہمی پانے کی اس کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے۔ ہاں، آسمان فوازش کے بادلوں سے زمین کی سیرابی کا سامان ضرور کرتا رہتا ہے۔

اس روز دونوں چپ تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم۔ لیکن پھر بھی نبھانے کیوں وہ خاموشی خاموشی نہیں لگ رہی تھی۔

الہی بخش نے گاڑی روکی۔ سادی نے اترنے سے پہلے اسے خوب صورت پھول دار کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ دیا ”یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔“

”شکریہ بی بی۔ لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے میری سالگرہ یاد رکھی ورنہ ہم لوگ تو خود بھی اپنی سالگرہ یاد نہیں رکھتے۔“

”تحفوں کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے الہی بخش۔“ سادی نے کہا ”تحفوں سے محبت بڑھتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تو چلی گئی۔ الہی بخش اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ ”ٹھیک کہتی ہو سادی بی بی۔ اس لئے تو اللہ اپنے بندوں کو تحفوں سے نوازتا رہتا ہے۔ لیکن بندوں کی محبت تو نہیں بڑھتی پھر بھی۔ کم از کم میرے جیسے بد نصیب بندوں کی۔“

پہلی بار باپ کی بات کا مفہوم اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

داخلہ کے لئے خط لکھیں

نخواتین و حضرات! ہم بذریعہ ڈاک

• اینگلش لینگویج • پیننگ • فلاور میکنگ

• بیوٹیشن • فنڈیکل بیوٹی • انٹریڈ ڈیکوریشن

• لیڈیز ٹیلرنگ • کوکنگ • بیکنگ

• مہر سازی • فوٹو گرافی • کمرشل آرٹ

• ریفریکریشن • میڈیکل ایڈ • اسکول ٹیچنگ

اور ریڈیو ٹی وی، اردو میں بالتصویر لیکچررز و کتب

کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ داخلہ کیلئے تفصیلات جوابی لفافے سے منگائیں۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔

اسلام آباد اکیڈمی

۲۵۱ سیکٹر آئی۔ ٹین۔ ون، اسلام آباد

دوسرے کو وہ سادی کو کالج سے واپس لایا تو بیگم صاحبہ لان کے باہر کھڑی کرمو سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے الٹی بخش کو جو اس محلے میں دیکھا تو پہلے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر ان کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں ”یہ تم ہو الٹی بخش۔ اور تو آؤ ذرا۔“ انہوں نے نکارا۔

الٹی بخش سمجھ گیا کہ عزت افزائی کے فوراً بعد بے عزتی کا لمحہ بھی آگیا ہے۔ یہ بھی رب کی عنایت ہے کہ سر غرور اٹھنے نہ پائے اور سر میں کوئی سودا جگہ نہ بنائے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بیگم صاحبہ کی طرف بڑھا۔

”یہ کیا طالع بنا رکھا ہے الٹی بخش؟“ بیگم صاحبہ نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں بیگم صاحبہ۔“

”ہینٹ شرٹ پن کر شہری بابو بننے کا شوق کب سے ہو گیا تجھے؟“ بیگم صاحبہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔ نہ کبھی ہوگا۔ لیکن۔۔۔“ الٹی بخش کالجہ سخت ہونے لگا۔

اسی وقت اپنی کتابیں ہاتھ میں لئے سادی بھی وہاں آگئی ”کیا بات ہے امی؟“

الٹی بخش نے سر کھما کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں الجھا تھی۔ الٹی بخش موم ہو گیا۔

پرائٹ پڑیں۔ ”تمہیں کیا ضرورت ہے سچ میں بولنے کی؟“ بیگم صاحبہ سادی پر اٹ پڑیں۔

”ضرورت اس لئے ہے کہ یہ میرا ڈرائیور ہے۔“

”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کے لئے وردی ضروری ہے۔ وردی ہو تو آدمی کو اوقات یاد رہتی ہے۔ اب تم ہی دیکھو یہ ڈرائیور لگتا ہے کیسے۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں امی۔ وردی کو میں نے ہی منع کیا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ جو لباس چاہے پہنے۔ بس مجھے تماشا نہیں بننا۔“

”سادی۔۔۔ سادی تم نہیں جانتیں۔ کم اوقات آدمی جب اپنی اوقات بھولتا ہے تو سر پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔“ سگم صاحبہ کے لہجے میں بے بسی اور بھنبھلاہٹ تھی۔

”میں اپنی اوقات نہیں بھولا بیگم صاحبہ۔ نہ کبھی بھولوں گا۔“

الٹی بخش نے محل سے کہا ”مجھے یاد ہے کہ میں فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا چٹنر ہوں۔ میں کبھی آپ کے سر نہیں چڑھوں گا۔“

”تو پھر یہ کپڑے کیوں پہنے توئے؟ اس لباس میں سادی کی گاڑی کیوں لے کر گیا؟“

”میں کہہ رہی ہوں امی کہ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔“ سادی نے محلے لہجے میں کہا ”اور الٹی بخش صرف مجھ کو جواب دہ ہے۔ اگر آپ کو اختلاف ہے تو آپ بے فکر اس سلسلے

میں پایا سے بات کر لیں۔ مجھے کوئی دوسرا ڈرائیور ملے گا تو بھی یہی کچھ ہوگا۔ بات صرف الٹی بخش کی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ آج اس سلسلے میں بات ہوگی۔ پھر دیکھوں گی۔ تم بھی بہت آپ سے باہر ہو رہی ہو۔“ بیگم صاحبہ نے سادی کو لٹاڑا ”اچھا۔۔۔ اب اندر جاؤ پلیز۔“

سادی پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بیگم صاحبہ الٹی بخش کی طرف مڑیں ”دیکھو الٹی بخش، یہ تمہارا روزی کا معاملہ ہے۔ میں اس میں کوئی خرابی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ بہت گناہ کا کام ہے لیکن۔۔۔“

”میں بہت عاجزی سے آپ سے ایک عرض کروں۔“ الٹی بخش نے ان کی بات کاٹ دی ”سچ یہ ہے کہ میں فٹ پاتھ کی مزدوری میں بہت خوش تھا۔ اپنی اوقات میں خوش رہنے والا بندہ جو ٹھہرا۔ اور رزق دینے والا اللہ ہے۔ آپ اس معاملے میں میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں۔“

”تو پھر یہاں کیوں نوکری کر رہے ہو۔ چلے جاؤ فٹ پاتھ پر۔“

بیگم صاحبہ نے جل کر کہا ”میں تمہیں فارغ کر دیتی ہوں۔“

”بات آپ کی نہیں صاب جی کی ہے۔ صاب جی فٹ پاتھ والوں کو عزت دینے والے ہیں۔ ان سے میں انکار نہیں کر سکتا۔ آپ ان سے بات کر کے مجھے فارغ کرا دیں۔ میں ہنسی خوشی چلا جاؤں گا۔“

”بہت چالاک ہوتے ہو تم غریب لوگ۔“ بیگم صاحبہ نے زہریلے لہجے میں کہا ”اتنی تنخواہ چھوڑ کر ہنسی خوشی چلے جاؤ گے مگر وہ بے وقوف شیخ صاحب جو مل گئے ہیں تو خوب عیش کرو۔“

الٹی بخش کا چہرہ تھما اٹھا ”تنخواہ کی بات نہیں۔ میں تین وقت کی روٹی پر بھی یہاں نوکری کر سکتا ہوں، صاب جی کہہ کر تو دیکھیں۔“

”نہ وہ کہیں گے نہ تم جاؤ گے۔“

”چلیں، آج میں خود بات کر لیتا ہوں صاب جی سے کہ مجھے آزاد کر دیں۔“

بیگم صاحبہ گڑبڑا گئیں۔ جانتی تھیں کہ اس معاملے میں شیخ صاحب سخت ہو جائیں گے۔ وہ احسان ماننے والے آدمی تھے۔ ان کی خبر بھی لے لیں گے ”نہیں، اس کی ضرورت نہیں الٹی بخش۔“

انہوں نے نرم لہجے میں کہا ”بس اپنی اوقات میں رہو۔ آئندہ ان کپڑوں میں گاڑی کبھی نہ چلاؤ۔ اب اپنے کوارٹر میں جاؤ۔“

الٹی بخش اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

کائنات کے خوب صورت ترین جذبے عشق کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس داستان کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔

کائنات کے خوب صورت ترین جذبے عشق کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس داستان کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔

کائنات کے خوب صورت ترین جذبے عشق کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس داستان کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔

کائنات کے خوب صورت ترین جذبے عشق کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس داستان کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔

کائنات کے خوب صورت ترین جذبے عشق کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس داستان کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔

کائنات کے خوب صورت ترین جذبے عشق کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس داستان کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔